سورة الفاتحة

کتابچہ ۲

مؤلف

مولوی محمد ارشاد علی

جملہ حقوق اشاعت بحق مؤلف محفوظ

تفصیلات طباعت

نام کتاب	سورۃالفاتحۃ
مؤلف	محمد ارشاد علی مولوی عالم (نظامیہ)
صفحات	۷۷
اشاعت	مارچ ۲۰۱۹
قیمت	مُفت
اہتمام	صاحبزادہ محمد طاہر علی
ای میل	islahitohfa@gmail.com

مزید موضوعات

https://islahitohfa.com

تنبیہ

اس کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔ یہ دستاویز ایک آن لائن کتاب ہے، اس کتاب کو خصوصی طور پر انٹرنیٹ کے ذریعہ مفت فراہم کرنے کے لئے فارمیٹ اور ڈیزائن کیا گیا ہے۔اس کتاب کو اسی شکل میں بغیر کسی تبدیلی کے،اس کی تقسیم، طباعت، فوٹو کاپی اور الیکٹرونک ذرائع کے ذریعہ اس کی تقسیم اور اس کے مواد کو پھیلانے کی اجازت دیتا ہے۔اس شرط کے ساتھ کہ اس سے مالی طور پر نفع حاصل نہ کی جائے۔

ترتیب

کتابت وحی ۵
تدوین قرآن ۵
حضرت عثمان بن عفانؓ کی خلافت میں قرآن کے جمع کرنے کا کام: ۶
الفاظ قرآن ۷
حرکات اور نقطے ۷
احزاب یا منزلیں ۸
اجزاء یا پارے ۸
اخماس اور اعشار ۹
رکوع کا تعیّن ۹
رموز و اوقاف ۱۰
رموز کی تفصیل ۱۱
علم تفسیر ۱۳
تفسیر قرآن کے ماخذ ۱۴
تفسیر قرآن کے بارے میں ایک شدید غلط فہمی ۱۸
مشہور تفاسیر ۲۰
سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ ۲۲
آیت کے اسماء الحُسنٰی ۲۸
رحمٰن و رحیم ۲۸
دعا اور جواب دعا ۲۹
جملہ اسمیہ اور اسمیہ جملے کا فرق ۲۹
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِینَ ۳۰

تعریف صرف اللہ ہی کیلئے ہے ۳۱
مخلوق پرستی کی جڑ کٹ گئی ۳۱
الرَّحمٰنِ الرَّحِیم ۳۳
یوم جزا کی ضرورت کیوں ہوئی؟ ۳۴
روز جزاء کی آمد ۳۵
عبادت اور اطاعت ۳۷
عبادت کس کا نام ہے؟ ۳۹
لفظ قرآن کی لغوی تعریف ۴۱
اللہ کی معرفت ہی سب سے بڑا علم ہے ۴۴
سب کو فطری ہدایت ۴۴
ہدایت کا دوسرا درجہ ۴۶
تیسرا درجہ ہدایت ۴۶
الصِّرَاطَ الْمُستَقِیمَ کون سا راستہ ہے ۴۸
صراط رسول یا صراط قرآن کیوں نہیں کہا گیا؟ ۵۰
اگر کتاب کافی ہوتی تو رسول کی ضرورت نہ ہوتی ۵۱
فرقہ وارانہ اختلافات کا سبب ۵۲
سورہ فاتحہ کے متعلق احکام و مسائل ۵۲
دعا کرنے کا طریقہ ۵۲
اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا انسان کا فطری فرض ہے۔ ۵۳
ایک منٹ کے عمل میں کیا کیا ہوتا ہے؟ ۵۴
حمد کی حقیقت کیا ہے۔ ۵۵
خود اپنی مدح اور ثنا کسی انسان کیلئے جائز نہیں ہے۔ ۵۶

لفظ رب اللہ تعالیٰ کا خاص نام ہے۔............ ۵۷
حلال اور حرام کسی چیز کو ٹھیرانے کا حق صرف اللہ ہی کی ہے۔............ ۵۸
کتاب-قرآن............ ۵۹
سورۃ فاتحہ دعا ہے۔............ ۶۳
سورہ الفاتحہ ایک دیباچہ ہے............ ۷۱
سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ میں تعلق............ ۷۳

ISLÁHI TOHFA

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيم

سورۃالفاتحہ

کتابت وحی

عہد نبوت میں کتابت وحی کے فرائض انجام دینے والے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ۔

(۱) حضرت زید بن ثابتؓ (۲) حضرت ابو بکرؓ (۳) حضرت عمرؓ (۴) حضرت عثمانؓ (۵) حضرت علیؓ (۶) حضرت ابی بن کعبؓ (۷) حضرت زبیر بن عوامؓ (۸) حضرت معاویہؓ (۹) حضرت مغیرہ بن شعبہؓ (۱۰) حضرت خالد بن ولیدؓ (۱۱) حضرت ثابت بن قیسؓ (۱۲) حضرت ابان بن سعیدؓ

تدوین قرآن

قرآن کو ایک جگہ کرنے کا کام حضرت ابو بکر صدیق ؓ خلیفہ اول نے حضرت عمر فارقؓ کے اسرار پر حضرت زید بن ثابتؓ کے حوالے کیا۔ حضرت زید بن ثابتؓ، خود حافظ قرآن تھے۔ وہ خود اپنی یاد داشت سے پورا قرآن لکھ سکتے تھے۔ ان کے علاوہ بھی اس وقت سینکڑوں حفاظ موجود تھے۔ جمع کرنے کے دوران اگر کوئی آیت لیکر آتا تو حضرت زید اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما مشترک طور پر اس کو وصول کرتے تھے پھر اس آیت پر دو گواہوں کی گواہی ہوتی۔ بہر حال اس زبردست احتیاط کے ساتھ آیات قرآنی کو جمع کیا گیا اور انکو کاغذ کے صحیفوں پر مرتب شکل میں تحریر کیا گیا۔ حضرت ابو بکرؓ کے عہد خلافت اور انکی زندگی میں یہ

صحیفے آپ ہی کے پاس رہے۔ پھر خلیفہ ثانی حضرت عمر بن خطابؓ کے پاس، پھر حَفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس منتقل کیئے گئے۔ پھر ان کی وفات کے بعد مروان بن حکم کے حکم سے انکو نذرآتش کر دیا گیا کیونکہ اُس وقت حضرت عثمانؓ کے تیار کردہ مصحف موجود تھے۔

حضرت عثمان بن عفانؓ کی خلافت میں قرآن کے جمع کرنے کا کام:

خلافت عثمان ۲۴ھ -۳۶ھ = ۱۲سال۔

بفضل تعالیٰ دین اسلام جان نثار صحابہ کرام رضی تعالیٰ عنھم اجمعین کی شب و روز جان فشانی سے مملکت عرب سے نکل کر عربستان کے شمال مغرب یعنی سلطنت روم اور سلطنت ایران اور آگے دور دور علاقوں تک پہنچ چکا تھا۔ ہر ملک کے باشندے، مجاہدین اسلام سے قرآن سیکھتے تھے۔ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا تھا یعنی مختلف قراءتوں کے تحت قرآن مجید پڑھا جاتا تھا۔ جب یہ قرآن کو پڑھنے کے یعنی قرأت کے مختلف طریقے دور دراز مالک تک پہنچے تو اختلافات پیدا ہونے لگے۔ حضرت حذیفہ بن یمانؓ آرمینیہ اور آذر بائیجان کے محاذ پر تھے اور جہاد میں مشغول تھے۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ لوگ قرآن کریم کی قراءتوں کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ مدینہ واپس ہو کر حضرت عثمانؓ سے فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ شام کے لوگ حضرت ابی بن کعبؓ کی قراءت پڑھتے ہیں جس کو اہل عراق نے نہیں سنا اور اہل عراق، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت پڑھتے ہیں۔ جسکو اہل شام نے کبھی نہیں سنا ہے۔

نتیجتاً ایک دوسرے کو کافر قرار دیتے ہیں۔ ہوا ایسا کہ ایک معلم قرآن نے ایک قرأت کے مطابق شاگردوں کو پڑھایا اور دوسرے معلم قرآن نے دوسری قرأت

کے مطابق پڑھایا، اسطرح مختلف اساتذہ قرآن کے شاگرد جب باہم ملے تو ان میں اختلاف ہوا اس شکایت پر خلیفہ ثالثؓ نے صحابہ کرام سے مشورہ طلب کیا۔ صحابہ کا اتفاق رائے سے اس اختلاف کو دور کرنیکے لیے حضرت حفصہؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ کے پاس حضرت ابو بکرؓ کے تیار کئے ہوئے جو صحیفے ہیں انکو ہمارے پاس بھیج دو، ہم انکو مصحف میں نقل کر کے پھر واپس کر دینگے۔ پھر حضرت عثمانؓ نے ایک جماعت تشکیل دی جو صحابہ پر مشتمل تھی اور انکے ذمہ ایک کام کیا۔ یہہ صحابہ کرام چار تھے۔ اسطرح قرآن کریم کے متعدد نسخے تیار کرنیکے بعد حضرت عثمانؓ نے وہ تمام انفرادی نسخے نذر آتش کر دیے جو صحابہ کرام کے پاس متفرقہ طور پر تھے۔ حضرت عثمانؓ اور کے اس کام پر امت کا اجماع ہو گیا کہ قرآن کریم کو رسم عثمانی کے خلاف، کسی اور طریقے سے لکھنا ناجائز ہے۔

الفاظ قرآن

لیکن اب تک قرآن کے الفاظ پر نہ نقطے لگائے گئے تھے اور نہ اعراب، تاکہ لوگ قرآن کریم کو متواتر قراتوں کے مطابق پڑھ سکیں جیسے سسرھا تاکہ اسکو نَنْشُزُهَا اور نَنْشِزُهَا دونوں طریقوں پر پڑھ سکیں کیونکہ یہ دونوں قراِت درست ہیں۔

حرکات اور نقطے

الفاظ پر نقطہ اور اعراب نہ لگانیکی وجہ سے اصل عجم (یعنی جو عربی نہ جانتے یا جن کی زبان عربی نہیں ہے) یعنی عرب قوم کے علاوہ دیگر ممالک کے لوگ جو عربی زبان سے واقف نہیں تھے ان کو تلاوت میں دشواری تھی چنانچہ جب اسلام عجمی ممالک (غیر عربی) میں پھیلا تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ قرآن کے الفاظ پر نقطے اور اعراب لگائے جائیں۔

اب اس میں مختلف روایات ہیں کہ قرآن کریم کے نسخے پر سب سے پہلے نقطے کس نے لگائے۔ بعض روایات سے ظاہر ہے کہ یہ کام سب سے پہلے حضرت ابو الاسود دولی رحمہ نے انجام دیا۔ بعض کا کہنا ہے کہ اُنھوں نے حضرت علیؓ خلیفہ چہارم کی تلقین کے تحت کیا اور بعض کا کہنا ہے کہ گورنر کوفہ زیاد بن سفیان نے ان سے یہ کام کروایا۔ اور ایک روایت بھی ہے کہ حجاج بن یوسف نے حضرت حسن بصری رحمہ اور یحیٰی بن یعمر اور نصر بن عاصم لیثی رحمہ کے ذریعے یہ کام انجام دیا گیا۔

احزاب یا منزلیں

صحابہ کرام اور تابعین کرام کا معمول یہ تھا وہ ہر ہفتہ ایک قرآن، ختم کر لیتے تھے۔ اس مقصد کی تکمیل کی خاطر انہوں نے روز تلاوت کی ایک مقدار مقرر کر لی تھی۔ جسکو حِزب یا منزل کہا جاتا ہے۔ اسطرح پوری قران کو کل "۷" احزاب پر تقسیم کیا گیا تھا۔

اجزاء یا پارے

قرآن کریم پورا، تیس اجزاء پر تقسیم کیا گیا ہے جن کو "۳۰" پارے کہا جاتا ہے۔ (پارہ فارسی کا لفظ ہے جس کے معنی ہے ٹکڑا، حصّہ) یہہ پاروں کی تقسیم معنی کے اعتبار سے نہیں بلکہ بچوں کو پڑھانے کے اعتبار سے سہولت کو نظر میں رکھتے ہوئے، ۱۱۴ سورتوں کو (۳۰) مساوی حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

نوٹ :- بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقسیم عہد صحابہ کے بعد تعلیمی سہولت کے مد نظر کیگئی ہے۔

اخماس اور اعشار

خمسؐ کی جمع اخماسؒ اور عشرہ کی جمع عُشرؒ ہے۔ قرونِ اولیٰ یعنی قدیم زمانے کے قرآنی نسخوں میں ایک علامت کا رواج تھا کہ ہر پانچ آیات پر خمس یا "خ" اور ہر دس آیات کے بعد لفظ عشر یا "ع" لکھ دیتے تھے۔ ان علامات کو اخماس اور اعشار کہا جاتا ہے۔ اب یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ علامات سب سے پہلے کس نے لگائیں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ ایسے نشانات لگانے کو مکروہ سمجھتے تھے۔ بعد میں یہ علامات مَتْرُوک (ترک کیا ہوا) ہو گئے۔

رکوع کا تعیّن

"ع" رکوع کی علامت ہے۔ رکوع کا تعیّن، قرآن کریم کے مضامین کے لحاظ سے کیا گیا ہے۔ یعنی ایک سلسلہ کلام ختم ہوا تو وہاں رکوع کی علامت لگا دی گئی۔ اس علامت کا مقصد، آیات کی ایک ایسی مقدار متوسط کا تعیّن ہے جو ایک رکعت میں پڑھی جا سکے۔ اور اس کو رکوع بھی اسلئے کہتے ہیں کہ نماز میں نمازی اس جگہ پہنچ کر رکوع کرتا ہے۔

رَكَعَ - يَرْكَعُ = رَكعاً = رُكُوْعاً = سر جھکانا، رکوع میں جانا۔

علماء کرام نے قرآن کریم کو (۵۴۰) رکوع میں تقسیم کیا ہے تا کہ رمضان میں تراویح میں روزانہ ۲۰ رکوع پڑھتے ہوئے، ۲۷ ویں شب، قرآن مجید ختم ہو سکے

۲۰ * ۲۷ = ۵۴۰ (رکوع)

مذکورہ علامت یہ واضح کرتی ہے کہ سورت کے پہلے رکوع میں ۷ آیات ہیں جن میں ایک مضمون کی تکمیل ہو گی ہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ رکوع کی علامت کی ابتداء کس نے کی؟ اور کس زمانے میں کیگئی ؟

یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ اس علامت کا مقصد آیات کی ایسی متوسط مقدار کی تعیین ہے جو ایک رکعت میں پڑھی جا سکے۔ اور اسکو رکوع اسلئے کہتے ہیں کہ نمازی نماز میں اس جگہ پر پہنچ کر رکوع کرے۔ اسطرح پوری قرآن میں ۵۴۰ رکوع ہیں۔ اس طرح اگر تراویح کی نماز میں ہر رکعت میں ایک رکوع پڑھا جائے تو ۲۷ ویں شب میں قرآن ختم ہو گا۔ (۲۰ رکعت x ۲۷ = ۵۴۰)

رموز و اوقاف

تلاوت قرآن اور تجوید کی سہولت کیلئے ایک اور مفید کام کیا گیا کہ مختلف قرآنی آیات پر ایسے اشارے کھدیے گئے ہیں جن سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کس جگہ وقف کرنا (یعنی سانس لینا) کیسا ہے؟ ان اشارات کو رموز اور اوقاف کہتے ہیں۔ اور ان کا مقصد یہ ہے کہ ایک غیر عربی دان انسان بھی جب تلاوت کرے تو صحیح مقام پر وقف ہو سکے۔ اور غلط جگہ سانس توڑنے سے معنی میں کوئی تبدیلی پیدا نہ

ہو۔ ان میں سے اکثر رموز سب سے پہلے علامہ ابو عبد اللہ محمد بن طیفور السجاوندی رحمہ نے وضع فرمایا۔

رموز کی تفصیل

(۱) "ط" - یہ وقف مطلق کا مخفف ہے۔ (یعنی مختصر کیا ہوا) اور اسکا مطلب یہ ہے کہ یہاں بات پوری ہو گئی ہے، اسلئے اس جگہ وقف کرنا بہتر ہے۔

(۲) "ج" - یہ وقف جائز کا مخفف ہے یعنی یہاں وقف کرنا جائز ہے۔

(۳) "ز" - یہ وقف مُجُوَّز کا مخفف ہے یہاں وقف کرنا درست تو ہے لیکن وقف نہ کرنا بہتر ہے (جَوَّزَ - یُجُوِّزُ = تَجْوِیْزاً - جائز ٹھیرانا) مُجَوَّزٌ اسم مفعول۔

(۴) " ض" - یہ وقف مُرَخَّص (رخصت کیا گیا) کا مخفف ہے اسکا مطلب ہے کہ یہاں بات پوری نہیں ہوئی۔ لیکن چونکہ آیت طویل ہو گئی ہے اسلئے سانس لینے کی خاطر یہاں وقف کرے، سانس لیں (رَخّصَ - یُرَخِّصُ = تَرْخِیْصًا) ممانعت کے باوجود اجازت دینا یعنی مجبوراً، سانس لینے کی خاطر وقف کرنا۔

(۵) "م" یہ وقف لازم کا مخفف ہے۔ اسکا مطلب ہے کہ اگر وقف نہ کیا جاتا ہے تو آیت کے معنی میں فحش (یعنی بڑی غلطی) کا امکان ہے۔ لہٰذا یہاں وقف کرنا زیادہ بہتر ہے۔ بعض حضرات اس وقف کو واجب بھی کہتے ہیں۔ یہ واجب فقہی واجب نہیں ہے کہ جس کے ترک سے گناہ ہو بلکے یہاں پر وقف کرنا سب سے بہتر ہے (خَفَّفَ - یُخَفِّفُ - تَخْفِیْفًا - کم کرنا) مُخَفِّفًا اسم مفعول، کم کیا ہوا۔ گھٹایا ہوا۔

(۶) "لا" کے معنی "نہیں" ہیں، یہ علامت کہیں آیت کے اوپر استعمال کی جاتی ہے اور کہیں عبارت کے اندر۔ عبارت کے اندر ہو تو ہر گز نہیں ٹھہرنا چاہیے البتہ

آیت کے اوپر ہو تو اس پر ٹھہرنے یا نہ ٹھہرنے میں اختلاف ہے لیکن ٹھہرا جائے یا نہ ٹھہرا جائے اس سے مطلب میں خلل واقع نہیں ہوتا۔

بلکہ اس میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں وقف کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسکے بعد والے لفظ سے ابتداء کرنا یہ بھی جائز ہے۔ لیکن اسکا صحیح مطلب یہ ہے کہ اگر اس پر وقف کریں تو اسکو دوبارہ لوٹا کر پڑھا جائے۔ اگلے جملے کے لفظ سے ابتداء کرنا مستحسن نہیں ہے۔

مذکورہ سارے رموز علامہ سَجاوندیؒ کے وضع کئے ہوئے ہیں ان رموز کے علاوہ بھی بعض رموز اور قرآن مجید میں پائے جاتے ہیں۔ جو حسب ذیل ہیں۔

(۷) "مَعَ" - یہ معانقہ کا مخفف ہے قرآن میں یہ علامت اُس جگہ لکھی جاتی ہے جہاں ایک ہی آیت کی دو تفسیریں ممکن ہیں۔ ایک تفسیر کے مطابق وقف ایک جگہ ہو گا اور دوسری تفسیر کے مطابق دوسری جگہ وقف ہو گا۔ معانقہ کا رمز علامت "∴" ہے۔ ایک مثال: ﴿ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ ۛ فِيهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ﴾ اگر آپ فِيهِ کو ملا کر پڑھیں تو ایک تفسیر ہو گی (یعنی یہ کتاب یعنی قرآن مجید اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کلام خدا ہے۔ اگر آپ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ پڑھینگے تو ترجمہ (خدا سے ڈرنے والوں کیلئے اس میں ہدایت ہے۔ معانقہ والی آیت میں دو جگہ وقف نہ کریں۔ اس علامت کی نشان دہی سب سے پہلے امام ابوالفضل رازی نے کی ہے۔

(۸) "سکتہ" اس علامت کا مقصد یہ ہے کہ قاری یہاں رکنا چاہیے لیکن سانس نہ ٹوٹے۔ یہہ علامت اُس جگہ لائی جاتی ہے جہاں پر ملا کر پڑھنے سے معنی میں غلط فہمی کا اندیشہ ہو۔ قرآن میں چار سکتہ ہیں۔ سورہ یٰس (۵۲) ﴿قَالُوا يَا وَيْلَنَا مَن بَعَثَنَا مِن مَّرْقَدِنَا ۜ هَٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمَٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ﴾ (الف پر سکتہ) پھر هَٰذَا پڑھیں۔

(۹) "وَقفَه" - اس جگہ سکتہ سے زیادہ ٹھیرنا چاہیے۔ لیکن یہاں پر بھی سانس نہ ٹوٹے۔

(۱۰) "قِف"- اس کے معنی ہیں یہاں ٹھیر جاؤ۔ یہ اُس جگہ لایا جاتا ہے جہاں قاری کو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ یہاں وقف کرنا درست نہیں ہے۔

(۱۱) "ق" یہ "قِيْلَ عَلَيْهِ الْوَقْفُ" کا خلاصہ ہے یہاں ٹھہرنا نہیں چاہیے۔ بعض حضرات کے پاس یہاں وقف ہے اور بعض کے نزدیک نہیں ہے۔

(۱۲) "صلے" یہ الوَصلُ اَولٰی کا مُخَفَّف ہے۔ یہاں ملا کر پڑھنا بہتر ہے۔

(۱۳) "صَل" یہ قَدْ یُوصَلْ کا مُخَفَّف ہے یعنی یہاں بعض حضرات ٹھیرتے ہیں اور بعض ملا کر پڑھتے ہیں۔

(۱۴) "وقف النبیؐ" اُن مقامات پر لکھا جاتا ہے جہاں کسی کسی روایت کی رو سے یہ ثابت ہے کہ حضور ﷺ دوران تلاوت اس جگہ وقف فرمایا تھا۔

علم تفسیر

عربی زبان میں تفسیر کے لفظی معنی "کھولنا" ہے۔ علم تفسیر اُس علم کو کہتے ہیں جس میں قرآن کے معنی بیان کئے جائیں اور اسکے احکام اور اسکی حکمتوں کو کھول کھول کر بیان کیا جاتا ہے۔﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾[النحل: ۴۴] (اور ہم نے قرآن آپ پر اتارا ہے تاکہ آپ لوگوں کے سامنے وہ باتیں وضاحت سے بیان کریں جو انکی طرف اتاری گئی ہیں)

چنانچہ رسول ﷺ صحابہ کرام کو قرآن کے الفاظ ہی نہیں سکھاتے تھے بلکہ اسکی پوری تفسیر فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کو ایک سورت پڑھنے میں بعض اوقات کئی کئی سال لگ جاتے تھے اس طرح جب تک حضور ﷺ دنیا میں تشریف فرما تھے، اسوقت تک کسی آیت کی تفسیر معلوم کرنا مشکل نہیں تھا۔ لیکن آپکے پردہ فرمانے کے بعد اس بات کی ضرورت محسوس ہوی کہ تفسیر قرآن کو ایک مستقل علم کی صورت میں محفوظ کیا جائے تاکہ اُمّت کیلئے قرآن کریم کے الفاظ کے ساتھ ساتھ اس کے صحیح معنی بھی محفوظ ہو جائیں۔ چنانچہ اللہ کے فضل اور توفیق سے امت نے وہ کارنامہ انجام دیا کہ آج اس کتاب کے الفاظ ہی نہیں بلکہ اس کی صحیح تفسیر و تشریح بھی محفوظ ہے جو رسول ﷺ کے جان نثاروں سے ہم تک پہنچی ہے۔

تفسیر قرآن کے ماخذ

تفسیر قرآن کے ماخذ کل چھ ہیں۔

(۱) قرآن شریف (۲) حدیث شریف (۳) اقوال صحابہ کرام (۴) اقوال تابعین کرام (۵) لغت عرب (٦) وتدبر و استنباط۔

قرآن شریف: علم تفسیر کا پہلا ماخذ خود قرآن کریم ہے چنانچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی آیت میں کوئی بات مجمل ہو اور تشریح طلب ہو تو خود قرآن کریم کی دوسری آیت اسکے مفہوم کو واضح کر دیتی ہے۔ جیسے سورۃ فاتحہ کی پانچویں آیت ہے ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ کی تشریح ﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ (یعنی ہم لوگوں کو، تواُن لوگوں کا راستہ دکھا جن پر تیرا انعام ہوا ہے۔ لیکن یہاں یہ بات واضح نہیں ہے کہ

کن لوگوں پر اللہ نے انعام فرمایا ہے۔ لیکن دوسری جگہ واضح طور پر متعین کر دیا گیا ہے۔ ﴿وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ ۚ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا﴾[النساء: ٦٩] (اور ان کو سیدھا راستہ دکھا دیتے ہیں جو اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت کریگا اور وہ اُن لوگو کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے۔ یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔ مفسرین قرآن کریم جب کسی آیت کی تفسیر کرتے ہیں تو سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ اس آیت کی تفسیر خود قرآن ہی میں کسی اور جگہ موجود ہے یا نہیں ہے؟ موجود ہو تو اسکو لے لیتے ہیں۔

حدیث شریف: حضور کے اقوال اور افعال کو کہتے ہیں۔اور قرآن کریم کے ساتھ آپ کو مبعوث ہی اس لئے فرمایا تھا کہ آپ لوگوں کے سامنے قرآن کریم کی صحیح تشریح کھول کھول کر بیان فرمادیں۔

حدیث - إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا (میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں)

چنانچہ آپ اپنے قول اور عمل سے یہ فریضہ بحسن وخوبی انجام دیا۔ در حقیقت آپکی پوری حیات مبارک قرآن کریم ہی کی عملی تفسیر ہے۔ اس لئے مفسرین کرام قرآن کو سمجھنے کیلئے دوسرے نمبر یعنی حدیث پر زیادہ زور دیا ہے اور احادیث کی روشنی میں قرآن کریم کے معنی متعین کئے ہیں البتہ چونکہ احادیث میں صحیح، ضعیف اور موضوع ہر طرح کی روایات موجود ہیں اسلئے محقق مفسرین نے اسوقت تک کسی روایت کو قابل اعتماد نہیں سمجھتے جب تک کہ وہ "تنقید روایات" کے اصولوں پر پوری نہ اترتی ہوں۔ اور جو روایت جہاں نظر آجائے اسکو دیکھ کر قرآن کریم کی کوئی تفسیر متعین کر لینا درست نہیں ہے کیونکہ وہ روایت ضعیف دیگر

مضبوط روایتوں کے خلاف بھی ہو سکتی ہے در حقیقت یہ معاملہ بڑا نازک ہے۔ اور اس میں قدم رکھنا ان ہی کا کام ہے جو اپنی عمریں ان علوم کو حاصل کرنے میں گزاری ہوں۔

نوٹ۔ قرآن کی ۱۱۴ سورتیں ۶۶۶۶ آیات پر مشتمل ہیں اور انکی تفسیر اور توضیح اور تشریح اور معانی متعین کرنے کے لیے تخمیناً ۲۵ ہزار احادیث شریف ہیں۔

صحابہ کے اقوال:- صحابہ کرام نے قرآن کی تعلیم براہ راست حضور صلعم سے حاصل کی تھی اسکے علاوہ "نزول وحی" کے وقت یہ حضرات بنفس نفیس موجود تھے۔ اور انھوں نے نزول قرآن کریم کے پورے ماحول اور پس منظر کا بذات خود مشاہدہ فرمایا تھا۔ اسلئے فطری طور پر قرآن کریم کی تفسیر میں ان حضرات کے اقوال جتنے مستند اور قابل اعتماد ہو سکتے ہیں بعد کے لوگوں کو وہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا جن آیات کریمہ کی تفسیر قرآن یا حدیث سے معلوم نہیں ہو سکتی ان میں سب سے زیادہ اہمیت صحابہ کرام کے اقوال کو حاصل ہے۔ چنانچہ اگر کسی آیت کی ۲ تفسیر پر صحابہ کرام کا اتفاق ہو تو مُفسرین کرام اسی کو اختیار کرتے ہیں اور اسکے خلاف کوئی تفسیر بیان کرنا جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر کسی آیت کی تفسیر میں صحابہ کرام کے اقوال مختلف ہوں تو بعد کے مفسرین دیگر دلائل کی روشنی یہ دیکھتے ہیں کہ کون سی تفسیر کو ترجیح دی جائے۔ اس خصوص میں اہم اصول اور قواعد اصول فقہ، اصول حدیث اور اصول تفسیر مُدوّن ہیں۔

نوٹ: بوقت وصال ﷺ جملہ اصحاب ایک لاکھ ۲۴ ہزار تھے۔

تابعین کرام کے اقوال:- صحابہ کرا کے بعد تابعین کرام کا نمبر آتا ہے۔ یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے قرآن کریم کی تفسیر، صحابہ کرام سے سیکھی ہے۔ اسلئے ان کے اقوال بھی علم تفسیر میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اگرچہ اس معاملہ میں علماء کرام کا اختلاف ہے کہ تابعین کرام کے اقوال تفسیر میں حجت ہیں یا نہیں ہیں؟ لیکن اسکی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

لغت عرب :- قرآن کریم چونکہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔ اسلئے تفسیر قرآن کیلئے اس زبان پر عبور مکمل حاصل کرنا ضروری ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات ایسی ہیں کہ ان کے پس منظر میں چونکہ کوئی شانِ نزول یا کوئی فقہی یا کلامی مسئلہ نہیں ہوتا اس لیے اُنکی تفسیر میں آنحضرت ﷺ یا صحابہ یا تابعین کے اقوال منقول نہیں ہوتے چنانچہ انکی تفسیر کا ذریعہ صرف لغت عرب ہوتی ہے اور لغت ہی کی بنیاد پر انکی تشریح کی جاتی ہے اسکے علاوہ بھی اگر کسی آیت کی تفسیر میں کوئی اختلاف ہو تو مختلف آراء یعنی مختلف عقلمند اور صاحب علم حضرات کی رایوں میں فیصلہ کن نتیجے پر پہنچنے کیلئے علم لغت ہی سے کام لیا جاتا ہے۔

تَدبُّر اور استنباط:- یہ قرآن کریم کی تفسیر کیلئے آخری ماخذ ہے۔ قرآن کریم کے نکات اور اسرار ایک ایسا بحر ناپیدا کنار ہے جسکی کوئی حد و نہایت نہیں ہے چنانچہ جس شخص کو اللہ نے اسلامی علوم میں بصیرت عطا فرمائی ہے وہ جتنا اس میں غور و فکر کرتا ہے اتنے ہی نئے نئے اسرار اور نکات سامنے آتے ہیں چنانچہ مفسرین کرام بھی اپنے اپنے تدبر کے نتائج کو بھی اپنی تفسیر میں بیان فرماتے ہیں لیکن یہہ اسرار اور نکات اسی وقت قابل قبول ہونگے جبکہ وہ مذکورہ بالا پانچ ماخذ سے متصادم نہ ہوں۔ لہٰذا کوئی شخص اگر تفسیر قرآن میں کوئی ایسا نکتہ یا اجتہاد بیان کرے جو

قرآن سنت، اجماع، لغت، یا صحابہ اور تابعین کے اقوال کے خلاف نہ ہو۔ اور کسی شرعی اصول سے نہ ٹکراتا ہو۔ اگر ایسا ہے تو اُس کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔ کیونکہ قرآن وسنت اور شریعت کے بنیادی اصولوں کے خلاف کسی کی شخصی رائے ظاہر ہے کہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

تفسیر قرآن کے بارے میں ایک شدید غلط فہمی

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ﴾ [القمر: ١٧]

اور ہم نے قرآن کو سمجھنے کیلئے آسان کر دیا ہے تو کوئی ہے جو سوچے سمجھا۔

And we have indeed made the Quran easy to remember (understand & be mindful) but is there anyone who will mind.

(Understand & think)

اور جب قرآن کریم ایک آسان کتاب ہے تو اسکی تشریح کیلیے کسی لمبے چوڑے علم و فن کی ضرورت نہیں رہی۔ لیکن یہ استدلال ایک شدید مغالطہ ہے۔ جو خود کم فہمی اور سطحیّت پر مبنی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات دو قسم کی ہیں۔ ایک تو وہ آیات ہیں جن میں عام نصیحت کی باتیں سبق آموز واقعات، عبرت اور نصیحت کے مضامین بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً دنیا کی ناپائیداری، جنت اور دوزخ کے حالات، خوف خدا اور فکر آخرت پیدا کرنے والی باتیں اور زندگی کے سیدھے سادھے حقائق اس قسم کی قرآنی آیات بلا شبہ آسان ہیں اور جو شخص بھی عربی زبان سے واقف ہو وہ انکو سمجھ کر نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا

آیت میں اس قسم کی تعلیمات کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ ان کو ہم نے آسان کر دیا ہے چنانچہ اس آیت میں لفظ لِلذِّکْرِ (واسطے نصیحت کے) دلالت کرتا ہے۔

اسکے بر خلاف دوسری قسم کی آیات وہ ہیں جو احکام و قوانین اور علمی مضامین پر مشتمل ہیں اس قسم کی آیات کا کما حقہ سمجھنا اور ان سے احکام اور مسائل مستنبط کرنا، ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ جب تک اسلامی علوم میں بصیرت اور پختگی حاصل نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام کی مادری زبان اگرچہ عربی تھی لیکن وہ رسول صلعم کے قرآنی تعلیم حاصل کرنے میں طویل مدتیں صرف کرتے تھے۔ علامہ سَیُوطی رحمہ نے امام عبداللہ الرحمٰن سلمٰی رحمہ سے نقل کیا ہے کہ جن حضرات صحابہ نے سرکار دو عالم سے قرآن کریم کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے۔ مثلاً حضرت عثمان بن عفّانؓ، عبد اللہ ابن مسعودؓ انہوں نے ہمکو بتایا کہ جب وہ رسول صلعم سے دس آیات سیکھتے تو اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک کہ اُن آیات کے متعلق تمام علمی اور عملی باتوں کا احاطہ نہ کرلیں۔ وہ فرماتے تھے کہ تَعَلّمْنَا القرآنَ وَالْعِلْمَ وَالعَمَل جَمِیعاً یعنی ہم نے قرآن اور علم اور عمل ساتھ ساتھ سیکھا ہے۔ چنانچہ مؤطا امام مالک رحمہ میں روایت ہے کہ حضرت عبد ابن عمرؓ نے صرف سورہ بقرہ یاد کرنے میں پورے آٹھ سال صرف کئے، اور مسند احمدؒ میں حضرت انس فرماتے ہیں کہ ہم میں سے جو شخص سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران پڑھ لیتا تو ہماری نگاہوں میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا تھا۔

غور کرنیکی بات ہے کہ یہ حضرات صحابہ کرام جنگی مادری زبان عربی تھی اور جو عربی زبان کے شعر و ادب میں مہارت رکھتے تھے اور جن کو طویل قصیدے معمولی توجہ سے ازبر ہو جایا کرتے تھے انکو قرآن کریم کے یاد کرنے میں اور اسکے

معانی سمجھنے کیلئے اس قدر طویل مدت کی کیا ضرورت تھی کہ آٹھ آٹھ سال صرف ایک سورت پڑھنے میں ہو جائیں۔ اسکی وجہ صرف ایک تھی کہ قرآن کریم اور اسکے متعلقہ علوم سیکھنے کیلئے صرف عربی زبان کی مہارت کافی نہ تھی۔ بلکہ اسکے لئے رسول کی صحبت اور تعلیم سے فائدہ اٹھانا ضروری تھا۔

جب صحابہ کرام کو ان سب باتوں کے باوجود حضور سے تعلیم حاصل کر نیکی ضرورت تھی تو آج نزول قرآن کے سینکڑوں سال بعد عربی زبان کی معمولی شُدبُد علم رکھ کر کے یا صرف ترجمے دیکھ کر مفسر قرآن کا دعوی ایک بیجا جسارت اور علم دین کے ساتھ مذاق ہے۔

مشہور تفاسیر

عہد رسالت کے بعد یعنی ۲۳ سال بعد سے قرآن کریم کی بے شمار تفاسیر لکھی گئیں ہیں لیکن یہاں صرف اُن مشہور اہم تفاسیر کا اجمالی تعارف ضروری ہے وہ ہیں۔
(۱) تفسیر ابن جریر (۲) تفسیر ابن کثیر (۳) تفسیر قرطبی (۴) تفسیر کبیر (۵) تفسیر در منشور (۶) تفسیر بحر المحیط (۷) احکام القرآن الجصّاس (۸) تفسیر مظری، (۹) تفسیر روح المعانی۔

تفسیر ابن جریرؒ : اس تفسیر کا اصل نام جامع البیان ہے اور یہ علامہ ابو جعفر محمد بن جریر طبریؒ نے ۳۱۰ھ میں تالیف کی۔ یہ اہل سنت کے جلیل القدر عالم ہیں ان کا شمار ائمہ مجتہدین میں ہوتا ہے ان کی تفسیر ۳۰ جلدوں میں ہے اور بعد کی تفاسیر کیلئے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

تفسیر ابن کثیرؒ : حافظ عماد الدین ابوالفداء اسماعیل بن کثیر دمشقی شافعی رحمہ اللہ کی تصنیف ہے یہ آٹھویں صدی کے ممتاز اور محقق علماء میں سے ہیں ان کی تفسیر چار جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔اس تفسیر میں زیادہ زور تفسیری روایات پر دیا گیا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ مصنف روایتوں پر محدّثانہ تنقید بھی کرتے ہیں۔اس لحاظ سے یہ کتاب ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔ان کا وصال ۷۷۴ھ میں ہوا۔

تفسیر القرطبیّ رحمہ : تفسیر کا پورا نام جامع الاحکام القرآن ہے۔اندلس کے مشہور اور محقق عالم علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر بن خرح القرطبیّ رحمہ ہے فقہ میں امام مالک کے مسلک کے پیرو تھے اس کتاب کا مقصد قرآن کریم سے فقہی احکام و مسائل کا استنباط ہے۔ لیکن اس ضمن میں اُنھوں نے آیتوں کی تشریح، مشکل الفاظ کی تحقیق، اعراب و بلاغت اور متعلقہ روایات کو بھی تفسیر میں خوب جمع کیا ہے اور یہ کتاب ۱۲ جلدوں میں ہے۔آپ ۶۷۱ھ میں وفات پائے۔

تفسیر کبیر : یہ امام فخر الدین رازی رحمہ کی تصنیف ہے اور اس کا اصلی نام مفاتیح الغیب ہے۔ لیکن تفسیر کبیر کے نام سے مشہور ہے۔آپ کا وصال ۶۰۶ھ میں ہوا۔

تفسیر البحرُ المحیط : یہ علامہ ابوحیان غَرناطی اندلسی رحمہ کی تصنیف ہے۔ جو اسلامی علوم کے علاوہ علم نحو، بلاغت میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ چنانچہ تفسیر میں بلاغت کا رنگ، الفاظ کی تحقیق، ترکیبوں کے اختلاف اور بلاغت کے نکات بیان کرنے پر خاص زور دیے ہیں ان کا انتقال ۷۵۴ھ میں ہوا۔

اِحکام القرآن للجصاص : یہ ابو بکر جصاص رحمہ کی تصنیف ہے انہوں نے قرآن کریم سے فقہی احکام و مسائل کا استنباط کیا ہے ان کا انتقال ۹۸۰ ھ ہو میں ہوا۔

تفسیر الدر المنثور : یہ علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ کی تصنیف ہے ان کا انتقال ۹۱۰ ہجری میں ہوا۔

تفسیر مظہری : یہ علامہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمہ کی تصنیف ہے۔ اور اُنھوں نے اپنے شیخ طریقت مرزا مظہر جان جاناں دھلوی رحمہ اللہ کے نام پر اس تفسیر کا نام رکھا ہے۔ تفسیر بہت سادہ اور واضح ہے یہ ۱۲۲۵ھ میں وفات پائے۔

تفسیر روح المعانی : یہ بغداد کے آخری دور کے مشہور عالم علامہ سید محمود آلوسی رحمہ کی تصنیف ہے جو ۳۰ جلدوں پر مشتمل ہے۔انہوں نے تفسیر کو بڑی حد تک جامع بنانیکی کوشش کی ہے۔ لغت، نحو ،ادب اور بلاعنت کے علاوہ فقہ، عقائد، کلام، فلسفہ ہیئت، تصوف سب شامل کیے ہیں۔تاکہ کوئی علمی گوشہ نامکمل نہ رہے اس لحاظ سے یہہ جامع تفسیر ہے۔ان کی وفات ہے ٦٧٠ھ میں ہوئی۔

سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ

سورۃالفاتحہ دراصل ، پورے قرآن کیلئے بمنزلہ دیباچہ ہے اسکے مختلف ناموں میں ایک کافیہ بھی ہے۔اس سے یہ اشارہ ملتاہے کہ اس کے ۷ آیات خود کسی مضمون کو سمجھانے کیلئے کافی ہیں۔

سُورَةُ الْفَاتِحَة مَكِّيَّةٌ وَّ هِيَ سَبعَ آيَاتٍ (مکّہ میں نازل ہوئی اور اس کی سات آیات ہیں۔)

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ ﴿الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ ۝ ﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ ۝ ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝ ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ ﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝

تشریح:- یہ مکّی صورت ہے جس میں ۷ آیات ہیں۔ سورہ فاتحہ کو قرآن میں بہت سی خصوصیات حاصل ہیں۔

(۱) یہ کہ قرآن شریف اسی سے شروع ہوتا ہے۔

(۲) نماز اسی سے شروع ہوتی ہے

(۳) نزول کے اعتبار سے بھی سب سے پہلی سورت ہے جو کامل طور پر نازل ہوئی ہے۔ ورنہ سورۃ علق، مزمّل اور مدثّر کی چند آیات ضرور اس کے پہلے نازل ہوتی ہیں اسی وجہ سے اس سورت کا نام ہی فاتحۃ الکتاب ہے۔

(۴) اس سورت کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ سورت ایک لحاظ سے پورے قرآن کریم کا متن ہے اور سارا قرآن اسکی شرح ہے، اس اعتبار سے کہ پورے قرآن کے مقاصد ایمان اور عمل صالح میں دائر ہے اور ان دو چیزوں کے بنیادی اصول اس سورت میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ اسی وجہ سے سورہ فاتحہ کا نام ام القرآن اور ام الکتاب اور قرآن عظیم بھی احادیث صحیح میں آئے ہیں۔

اس سورت کا قاری اللہ سے دُعا بھی کرے کہ اسکو صراط مستقیم کی ہدایت عطا ہو۔ اسی دعا اور درخواست کا جواب پورا قرآن ہے گویا اللہ نے ذَٰلِكَ الْكِتَابُ فرما کر اشارہ کر دیا کہ جو تم مانگتے ہو وہ اس قرآن میں موجود ہے۔

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ سورۃ فاتحہ کی نظیر (مثل) نہ تورات میں نازل ہوی، نہ انجیل میں اور نہ زبور میں۔ یہاں تک کہ خود قرآن کریم میں دوسری سورت اسکے مثل نہیں ہے۔

حضرت امام اعظمؒ کا قول ہے کہ بسم اللہ بجز سورۃ نمل کے اور کسی سورت کا جز نہیں ہے بلکہ ایک مستقل آیت ہے جو ہر سورت کے شروع میں دو سورتوں کے درمیان بطور فصل نازل ہوئی ہے۔

فعل مقدر پر تقدیم مفعول، مفید تخصیص ہوتا ہے۔

بِسْمِ اللهِ اَقْرَأْ (یا) بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اَبْدَأُ

اگر مبتدا پر لام (یعنی اَل) ہو اور خبر پر بھی اَلْ تو خبر، مبتدا میں منحصر اور خاص ہو جاتی ہے۔ جیسے زیدٌ هُوَ القائم (یعنی قیام زید کے ساتھ خاص ہے) اگر صرف مبتدا پر (ال) ہو تو مبتدا، خبر پر منحصر ہو گی۔ جیسے الحمد للہ۔ حمد اللہ ہی پر منحصر ہے اور اللہ ہی کے ساتھ خاص ہے۔ اگر مبتدا اور خبر دونوں پر اَلْ ہو تو بھی، مقتدا، خبر پر منحصر ہو گا جیسے

حدیث - الدِّينَ النَّصِيحَة - دین صرف خبر پر منحصر ہے۔

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان اور رحم والے ہیں۔

شروع خدائے رحمان و رحیم کے نام سے۔ اللہ کے نام سے شروع کرنا تو تمام آسمانی کتابوں میں مشترک ہے۔ مگر مذکورہ الفاظ تو قرآن ہی کی خصوصیت ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ رسول خدا ﷺ بھی ابتدا میں ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کرنیکے لیے بِاسْمِكَ اَللّٰهُمَّ کہتے تھے لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی تو اسی کو اختیار فرما لیا اور ہمیشہ کیلئے یہ سنت جاری ہو گئی ہے۔

بہر حال دل گواہی دیتا ہے کہ اللہ نے اسکی تعلیم انسان کو بالکل شروع ہی میں دی ہو گی۔ چنانچہ نوحؑ کے متعلق قران میں نقل ہے کہ انہوں نے اپنے با ایمان متعلقین اور اپنے ساتھیوں کو جب کشتی میں سوار کر دیا تو اسوقت اس سے ملتے جلتے الفاظ ہی کہا تھا ﴿وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللَّهِ مَجْرَاهَا وَمُرْسَاهَا ۚ إِنَّ رَبِّي لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ [ہود: ۴۱] (نوح نے) کہا کہ خدا کا نام لے کر (کہ اسی کے ہاتھ میں اس کا) چلنا اور ٹھہرنا (ہے) اس میں سوار ہو جاؤ۔ بے شک میرا پروردگار بخشنے والا مہربان ہے

(11:41) Noah said: ' Embark in it. In the name of Allah is its sailing and its anchorage. My Lord is Ever Forgiving, Most Merciful.

حضرت سلیمان علیہ اسلام نے جب ملکہ سبا کو خط لکھا تو اس کا آغاز بھی ان ہی مبارک کلمات سے کیا تھا۔ ﴿إِنَّهُ مِن سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ﴾ [النمل: ۳۰] وہ سلیمان کی طرف سے ہے اور مضمون یہ ہے کہ شروع خدا کا نام لیکر جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

It is from Solomon, and it begins with the name of Allah, the Merciful, the Compassionate.

خدا کا کلام خبریہ نہیں ہے بلکہ دعا ہے یہ ایک فطری صدا ہے جو ہر قابل ذکر کام کرتے وقت اسکی زبان سے نکلنی چاہیے، اس فطری صدا کو وحی الہٰی نے الفاظ کا جامہ پہنا دیا ہے۔

کوئی کام کرتے وقت جب یہ دعا، ارادہ اور شعور کیسا تھ زبان سے نکلتی ہے تو اوّل پہلے قدم پر ہی انسان کو باخبر کر دیتی ہے کہ جو کام وہ کرنے جارہا ہے وہ کام ہر حال میں خدا کی پسند اور اسکے احکام کے تحت ہونا چاہیے۔ ثانیاً وہ اس دُعا کی برکت سے خدا کی دو عظیم صفتوں رحمان اور رحیم کا سہارا حاصل کر لیتا ہے۔ اور یہ دونوں صفتیں اس بات کی ضمانت ہیں کہ اللہ نے اس کام میں اسکو برکت عطا فرمائے اور اگر اس کام کے اختیار کرنے میں اس سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو اُس کے وبال سے اس کو محفوظ رکھے۔ اسکو تکمیل تک پہنچانے کی اسکو قوت اور ہمت دے۔ شیطان کی چالوں اور اسکے فریبوں سے اسکو امان میں رکھے اور آخرت میں اس کام کو نافع با برکت اور رضاءِ الٰہی کے حصہ کا ذریعہ بنائے۔ اور جو کام اس دُعا کے بغیر ہوتا ہے وہ ان تمام باتوں سے خالی ہوتا ہے۔

حدیث: جو کام بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت ہے۔ بسم اللہ کی یہ برکتیں تو ہر کام کے ساتھ ظاہر ہوتی ہیں لیکن خاص تلاوت قرآن کا آغاز اس دعا سے کرنے میں کچھ اور پہلو بھی ہیں۔ جنکو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

(۱) تلاوت کا آغاز اس کلمے سے کر کے بندہ اس حکم کی تعمیل کرتا ہے کہ جو اللہ نے اپنے پیغمبر کو بالکل ابتدائی وحی نازل کرتے وقت دیا تھا۔ ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾ [العلق: ۱] (اے محمد ﷺ) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے (عالم کو) پیدا کیا۔

(۲) کلمہ بندے کو اِس حقیقت کی یاددہانی کراتا ہے کہ انسان پر اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے انسان کو بول چال کی نعمت عطا کیا۔ جس کی بدولت وہ قرآن کی نعمت کا

مستحق بن سکا۔ صفت رحمان اس حقیقت کی طرف مشیر ہے۔ایک دوسری جگہ یہ بات وضاحت کیسا تھ کہی گئی ہے کہ یہ اللہ کی رحمانیت ہے کہ اُس نے انسان کو پیدا کیا اسکو بولنے کی صلاحیت دیا اور اس کو قرآن کی تعلیم دی (سورہ رحمٰن)

﴿الرَّحْمٰنُ ﴾﴿عَلَّمَ الْقُرْآنَ ﴾﴿خَلَقَ الْإِنسَانَ ﴾﴿عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴾ خداجو نہایت مہربان جو اُسی نے قرآن کی تعلیم فرمائی ، اسی نے انسان کو پیدا کیا، اسی نے اسکو بولنا سکھایا۔

(۳) یہ آیت ایک خاص پیشین گوئی کی تصدیق کر رہی ہے جس کی سند سابقہ آسمانی کتابوں میں موجود ہے کہ آپ ﷺ خلق خدا کو جو تعلیم دینگے وہ اللہ کا نام لیکر دینگے۔ تورات (پانچویں کتاب یعنی استثناء ، باب ۱۸، ۱۸۔۱۹)

میں ان کیلئے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیرے مانند ایک نبی پر پا کروں گا اور اپنا کلام اسکے منھ میں ڈالوں گا اور جو کچھ بھی اسکو حکم دونگا وہ اُن سے کہے گا اور جو کوئی میر نام لیکر کہیگا نہ سکنے گا تو میں اسکا حساب اس سے لونگا۔

(۴) چوتھا یہ کہ جس طرح قرآن مجید خدا کی صفت رحمانیت کا مظہر ہے اُسی طرح اسکی صفت رحمانیت ہی ہے۔ جو قرآن کے مفتح باب کی بنیاد ہے یعنی دروازہ کھولنے کی کنجی ہے۔ اسی سے اسکے بند دروازے کھولیں گے اور اسی سے اسکی مشکلیں آسان ہونگی اسی منبع فیض سے قاری پر معانی اور حقائق کا فیضان ہوگا اور اسی کے سہارے گمراہی دور ہوگی، نفس اور شیطان کی آفتوں سے محفوظ رہیگا۔

آیت کے اسماء الحُسنٰی

اللہ کے ناموں میں سے تین نام، اللہ، رحمان، رحیم کا ذکر ہے۔ اللہ کا لفظ الٰہ پر، الف لام تعریفی، داخل کر کے بنا ہے (اللہ) یہ نام ابتداہی سے صرف اسی خدائے برترکیلئے خاص رہاہے جو آسمان، زمین اور تمام مخلوق کا خالق ہے۔

نزول قرآن سے قبل عرب جاہلیت میں بھی اسکا یہی مفہوم تھا۔ اہل عرب مشرک ہونے کے باوجود اپنے دیوتاؤں میں سے کسی کو بھی خدا کے برابر قرار نہیں دیا۔ اور وہ دیوتاؤ کی پرستش محض اس گمان پر کرتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے مقرب ہیں اور خدا کے پاس انکی سفارش کرتے ہیں جیسے سورہ زمر آیت نمبر ۳، سورہ عنکبوت آیت نمبر ۶۱-۶۳، سورہ یونس آیت نمبر ۳۱۔

رحمٰن و رحیم

اسم رحمٰن، غضبان اور سکران کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ اور اسم رحیم، علیم، کریم کے وزن پر صفت ہے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ فَعِیلٌ کے وزن پر ہے یہ وزن دوام، استمرار اور پائیداری اور استواری پر دلیل ہے۔ اور رحمٰن کا وزن جوش و خروش کے ساتھ پائیداری اور استقلال بھی ہے۔ اللہ جوش میں دنیا کو پیدا کر کے پھر اس کی خبر داری اور نگہداشت سے غافل نہیں ہوا۔ بلکہ وہ اپنی پوری شان رحیمیت کے ساتھ اسکی پرورش، اور نگہداشت کر رہاہے کہ بندہ جب بھی اس کو پکارتا ہے تو اسکو دُعاؤں کو شرف قبولیت بخشتا ہے۔ پھر اسکی رحمتیں اس چند روزہ زندگی تک محدود نہیں ہیں بلکہ جو لوگ اسکے بتائے ہوئے راستہ پر چلتے رہینگے ان پر اسکی رحمتیں ایک ایسی ابدی اور لازوال زندگی میں بھی ہو گی جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔

دعا اور جواب دعا

انسان دعا فطرتاً اُسی چیز کی کرتا ہے، جس کی طلب اور خواہش اسکے دل میں ہوتی ہے۔ اور اسی صورت میں کرتا ہے جبکہ اسکو یہ احساس ہو کہ اسکی مطلوب چیز اکس ہستی کے اختیار میں ہے جس سے وہ دعا کر رہا ہے۔

پس قرآن کی ابتداء میں یہ تعلیم دے کر گویا انسان کو اسبات کی تلقین کیگئی کہ وہ قرآن کو راہ راست کی جستجو کیلیئے پڑھے۔ طالب حق کی ہی ذہنیت لیکر پڑھے اور یہ جان لے کہ علم کا سر چشمہ خداوند عالم ہے۔ اس لئے اس سے رہنمائی کی درخواست کر کے پڑھنے کا آغاز کرے۔ اس مضمون کو سمجھ جانے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن اور سورہ فاتحہ کے درمیان حقیقی تعلق کتاب اور اسکے مقدمہ کا سا نہیں ہے بلکہ دعا اور جواب دعا کا سا ہے۔ سورہ فاتحہ، دُعا ہے بندے کی جانب سے اور قرآن اسکا جواب ہے خدا کی جانب سے۔

بندہ دعا کرتا ہے کہ اے خدا تو میری رہنمائی کر، جواب میں پروردگار پورا قرآن انکے سامنے رکھ دیتا ہے کہ یہ ہدایت اور رہنمائی ہے جسکی درخواست تو نے مجھ سے کی تھی۔

جملہ اسمیہ اور اسمیہ جملے کا فرق :-

جملہ اسمیہ وہ جملہ ہے جو اصل میں جملہ اسمیہ تھا کہ اسکے شروع کا جز اسم ہو۔

جیسے اللّٰہُ رَحِیم - إِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ حكيم - وغیرہ

لیکن اسمیہ جملہ وہ ہے جو اصل میں جملہ فعلیہ تھا پھر کسی مخصوص غرض کی وجہ سے اسکو جملہ اسمیہ بنایا گیا ہو۔ جیسے الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ کہ یہ دراصل جملہ فعلیہ تھا

کہ اسکی اصل اَحْمَد اللہ حمداً تھا۔ فعل "اَحْمَد" کو حذف کیا گیااور مصدر "حَمْداً" کو اسکی جگہ رکھنے سے حَمْداً لِلہِ ہوا۔ (حَمْداً مصدر کو پیش دیگر "اَلْ" لگایا گیا تو "حَمداً" سے "اَلْحَمْدُ" ہوا۔(حَمِدَ – یَحْمَدُ= حمداً = محمداً فضیلت کی بناء پر تعریف کرنا، قابل تعریف پانا) معقول حمداً کو اسکی جگہ رکھ کر پیش دے کر اَلْ لگایا گیا۔ جو جنسیہ ہے۔اس طرح مبتدا بنا دیا۔ا جملہ اسمیہ میں جملہ فعلیہ کی بہ نسبت زور زیادہ ہوتا ہے۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

سب تعریفیں اللہ ہی کیلئے ہیں جو پالنے والا سارے جہان کا ہے۔
تعریف اللہ ہی کیلئے ہے جو تمام کائنات کا رب ہے۔
شکر کا سزاوار حقیقی اللہ ہے جو کائنات کا رب ہے۔

اللہ تعالیٰ کی پروردگاری اور اسکی بے انتہا اور بے پایاں رحمت اور اس کائنات (Universe) کے نظام میں اسکے قانون عدل کے مشاہدات سے ایک سلیم الفطرت انسان پر ایک زبردست جذبہ شکر طاری ہو جاتا ہے۔اسی جذبہ سے خدا کی بندگی اور خدا سے استعانت کا جذبہ اُبھرتا ہے پھر اسی جذبہ سے مزید طلب اور جستجو ہدایت اور رہنمائی کیلئے پیدا ہوتی ہے اسی کو اس سورت میں ظاہر کیا گیا ہے۔

خلاصہ :- سورہ فاتحہ کی ۷ آیات میں سے ابتدائی تین آیات اللہ کی حمد و ثنا پر مشتمل ہیں اور آخری تین آیات انسان کی طرف سے دعا اور درخواست کا مضمون رکھتی ہیں۔ درمیاں میں ایک آیت نمبر "۴" إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينَ ہے۔اس میں دونوں باتیں مشترک ہیں حمد و ثنا و دعا اور درخواست۔

سورہ فاتحہ ایک دعا ہے اور دُعا کی ابتداء اس ہستی کی تعریف سے کی جارہی ہے جن سے ہم دُعا مانگنا چاہتے ہیں یہ گویا اسبات کی تعلیم ہے کہ اللہ سے جب دعا مانگو تو مہذب طریقہ سے مانگو۔ تعریف کرنے کی دو وجوہات ہیں (۱) وہ خود حُسن و خوبی اور کمال رکھتا ہے۔ (۲) وہ ہمارا محسن ہے اور ہم اعتراف نعمت کے جذبے سے سرشار ہو کر اسکی خوبیاں بیان کرتے ہیں۔ یہ ہماری قدر شناسی اور احسان شناسی کا تقاضہ بھی ہے کہ ہم اس کی تعریف کریں۔

تعریف صرف اللہ ہی کیلئے ہے

بات صرف اس قدر نہیں ہے کہ تعریف اللہ کیلئے ہے بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ تعریف صرف اللہ ہی کیلئے ہے۔

﴿فَلِلَّهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمَاوَاتِ وَرَبِّ الْأَرْضِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝﴾ [الجاثیۃ: ۳۶-۳۷]

پس خدا ہی کو ہر طرح کی تعریف (سزاوار) ہے جو آسمانوں کا مالک اور زمین کا مالک اور تمام جہان کا پروردگار ہے اور آسمانوں اور زمین میں اُسی کے لئے بڑائی ہے۔ اور وہ غالب اور دانا ہے۔

مخلوق پرستی کی جڑ کٹ گئی

مذکورہ آیت کے ذریعے ایک زبردست اور اہم حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔ اس حقیقت کی پہلی ضرب سے مخلوق پرستی –(creation worship) کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ دنیا میں جہاں جس چیز اور جس شکل میں بھی کوئی حسن کوئی خوبی کوئی کمال ہے تو اسکا سرچشمہ اللہ ہی کی ذات ہے۔ کسی انسان ، کسی فرشتے، کسی دیوتا، کسی سیارہ، غرض کسی مخلوق کا بھی کمال ذاتی ہے بلکہ اللہ کا دیا ہوا ہے اللہ کا عطیہ ہے۔

ایسی صورتحال میں اگر کوئی پرستش کا مستحق ہے تو اور ہم اس کے گرویدہ ہیں اور پرستار ہیں اور احسان مند ہیں اور شکر گزار ہیں اور نیاز مند اور خدمت گار ہیں تو وہ خالق ہی ہے۔

حَمْدٌ (حَمِدَ - يَحْمَدُ = حَمْداً)-فضیلت کی بناء پر تعریف کرنا۔

حَمْدٌ کا ترجمہ عام طور پر قرآن کریم کے مترجموں نے "تعریف" کیا ہے۔اسکے معنی شکر کے بھی آتے ہیں جیسے﴿وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾[یونس:۱۰]

اوران کاآخری قول یہ ہوگاخداء رب العالمین کی تعریف اوراسکا شکر ہے۔

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ ۚ إِنَّ رَبِّي لَسَمِيعُ الدُّعَاءِ﴾

[إبراهيم: ۳۹]خداکا شکر ہے جس نے مجھ کو بڑی عمر میں اسماعیل اور اسحاق بخشے۔ بے شک میراپروردگار سننے والا ہے۔

اس کمالات کے لحاظ سے اگرچہ حمد کا لفظ، شکر کے مقابلہ میں زیادہ وسیع ہے اور شکر کا لفظ صرف ان ہی خوبیوں کو اور ہر قسم کے کمالات کے اعتراف کیلئے عام ہے خواہ اسکا کوئی فیض خود حمد کرنے والے کی ذات کو پہنچ رہا ہو یا نہ پہنچ رہا ہو۔تاہم شکر کا مفہوم اس لفظ کا جز غالب ہے۔اسلئے اس ترجمہ کا پورا پورا حق ادا کرنے کے لئے یا تو تعریف کے لفظ کے ساتھ شکر کا لفظ بھی ملانا ہوگا

رَبٌّ کا لفظ - (رَبَّ - يَرُبُّ - رَبّاً)-(ن) زیادہ کرنا، جمع کرنا، مالک ہونا، کسی کا کام درست کرنا، پرورش کرنا۔یہاں آیت میں رَبٌّ کے معنی پرورش کرنے والے کے ہیں۔ رَبٌّ دراصل پرورش کرنے والا ہی وہ حق پاتا ہے کہ وہ اس کا مالک اور آقا ہو۔یہاں آیت میں اللہ کی صفات میں سے پہلی صفت رَبٌّ، اسلئے لایا ہے کہ قرآن

کے اوّلین مخاطب جو تھے وہ اللہ ہی کو خالق کائنات مانتے تھے لیکن اسکے ساتھ کئی رب بنا رکھے تھے جن کی نسبت اُن کا گمان تھا کہ انکو اللہ نے اپنی کائنات کے انتظام میں اپنا شریک بنا رکھا ہے۔ اسی وجہ سے وہ ہماری عبادت اور ہماری اطاعت کے حقدار ہیں۔ اللہ کے بعد پہلی صفت رب لا کر انکے عقیدے کی تردید کر دی اور فرمایا کہ جو کائنات کا خالق ہے وہی رب بھی ہے وہی اس کا مالک اور وہی اسکا آقا ہے اور وہی مخلوق کی پرورش کرنے والا ہے۔

عَالَمِیْنَ : دراصل عالم کی جمع عَوَالِمُ، جمع مُکَسَّر ہے، لیکن یہاں العالمین استعمال ہوا ہے جو جمع مذکر سالم عَالَمُوْنَ کی مجروری کیفیت ہے۔

اس کے استعمال سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اس میں عقلمندوں کا غلبہ ہے جیسے انسان، جن، فرشتے، اس غلبہ کو ظاہر کرنیکے لیے عَالَمِیْنَ لایا گیا ہے۔ عَالَمِیْنَ میں دنیا کے تمام اجناس، انسان، آسمان، چاند، سورج تمام ستارے، ہوا، فضاء، و برق و باراں، فرشتے، جنات اور زمین اور تمام مخلوقات درند، چرند، پرند، حشرات الارض، ان سب کی تربیت کرنے والا ہے اسطرح سے سورہ فاتحہ کی ابتدائی تین آیات میں اللہ کی حمد و ثنا ہوی۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیمِ

یوم جزا کی ضرورت کیوں ہوئی؟

دنیا میں انسانی زندگی عارضی ہے دنیا ایک دار العمل ہے۔ دنیا نیک و بد اعمال کی جزا اور سزا کی جگہ نہیں ہے۔ بلکہ دار العمل ہے۔ فرض ادا کرنے کا دفتر اور جگہ ہے۔ تنخواہ وصول کرنے کی جگہ نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ دنیا میں کسی کو عیش و عشرت، دولت اور راحت، عیش و اکرام کی حالت میں دیکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اللہ کے نزدیک مقبول و محبوب ہے اسکے برعکس کسی کو رنج و مصیبت میں مبتلا دیکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اللہ کے نزدیک معتوب ہے۔ مختصر یہ کہ کسی کی خوشحالی اللہ کی رضا مندی کی دلیل نہیں ہے اور کسی کی بدحالی اللہ کی ناراضگی کی دلیل نہیں ہے۔

ہاں کبھی کبھی کسی عمل کی جزاء یا سزا کا ہلکا سا نمونہ دنیا میں ظاہر کر دیا جاتا ہے۔ یہ اس کے اعمال کا پورا بدلہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ہلکا سا متنبہ کرنیکے لیے ایک نمونہ ہے۔

﴿وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ [السجدۃ:۲۱]

اور ہم اُن کو (قیامت کے) بڑے عذاب کے سوا عذاب دنیا کا بھی مزہ چکھائیں گے۔ شاید (ہماری طرف) لوٹ آئیں۔

الغرض دنیا کی راحت اور مصیبت بعض اوقات تو امتحان اور آزمائش ہوتی ہے اور کبھی عذاب بھی ہوتی ہے مگر وہ عمل کا یوں پورا بدلہ نہیں ہوتا۔ قرآن میں دوسری جگہ آتا ہے۔ ﴿وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾ [الزمر: ۲۶] پھر ان کو خدا نے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھا دیا۔ اور آخرت کا عذاب تو بہت بڑا ہے۔ کاش یہ سمجھ رکھتے۔

بلکہ ایک نمونہ ہوتا ہے کیونکہ یہ چند روز زندگی محض عارضی ہے۔اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ نیک و بد کا عمل اور اس کی جزاء اس دنیا میں نہیں ملتا تو عدل و انصاف اور عقل کا تقاضہ ہے کہ نیک اور بد اور اچھا برا دونوں برابر نہ رہے بلکہ ہر عمل کی جزااور سزا ملنی چاہیے۔اسلئے ضروری ہے کہ ایک عالم کے بعد دوسرا عالم ہو۔

روز جزاء کی آمد

خدا کی پروردگاری اور اسکی رحمانیت اور رحیمیت کی نشانیاں روز جزاء کی آمد کو لازم کرتی ہیں۔ خدا کی پروردگاری سے روز جزاء پر استدلال قرآن مجید نے جگہ جگہ اسطرح کیا ہے کہ جس خدا نے تمہارے لئے زمین بنائی اور آسمان کا شامیانہ تانا، جس نے تمہارے لئے سورج ، چاند چمکائے، جس نے ابرو ہوا جیسی چیزوں کو تمہاری خدمت میں لگایا، جس نے تمہارے سب ظاہری اور باطنی ، روحانی اور مادی مطالبات کا بہتر سے بہتر جواب مہیا کیا۔ کیا ایسے خدا کے بارے میں تم یہ گمان کرتے ہو کہ بس اس نے تمہیں یوں ہی پیدا کر دیا ہے اور پیدا کر کے بس یوں ہی چھوڑ دیا، یہہ تمام کارخانہ محض کسی کھلنڈرا کا ایک کھیل ہے کہ جس کے پیچھے کوئی غایت اور مقصد ہو۔

پرورش کا یہ سارا اہتمام پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ سب کسی اہم مقصد کو لئے ہوئے ہے۔ اسطرح اللہ نے اپنے رحمان اور رحیم ہونے کا لازمی نتیجہ یہ قرار دیا ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں اچھے اور بروں کے درمیان انصاف ہو، نیکوں کو جزادے اور بدکاروں کو سزادے۔

ایک رحمان اور رحیم ہستی کیلئے یہ کسطرح ممکن ہے کہ یہ ظالم اور مظلوم، نیکو کار اور بد، باغی اور وفادار دونوں کے ساتھ ایک ہی طرح کا معاملہ کرے۔

﴿أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ﴾ [القلم : ۳۵] کیا ہم فرمانبرداروں کو نافرمانوں کی طرف (نعمتوں سے) محروم کردیں گے؟

اس طرح ہر چھوٹے بڑے اور اچھے برے عمل کا حساب اور اسکی جزا اور سزا ملے۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں روز جزاء کہا جاتا ہے۔ قرآن نے خود اس مضمون کو سورہ غافر: ۵۸ میں بیان فرمایا ہے۔﴿وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَلَا الْمُسِيءُ ۚ قَلِيلًا مَّا تَتَذَكَّرُونَ﴾ اور اندھا اور آنکھ والا برابر نہیں۔ اور نہ ایمان لانے والے نیکوکار اور نہ بدکار (برابر ہیں) (حقیقت یہ ہے کہ) تم بہت کم غور کرتے ہو۔

And the blind man and the Seer are not equal neither are those who believe and do good works equal with the evil doer. Little is that you mind

﴿إِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ [غافر: ۵۹]

(قیامت آنیوالی ہے اس میں کچھ شک نہیں اکثر لوگ ایمان نہیں رکھتے)

خلاصہ : سورہ فاتحہ کے شروع میں بیان کیا گیا تھا کہ اس سورت کی ابتدائی تین آیات میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کا بیان ہے انکی تفسیر سے یہ معلوم ہو گیا کہ پہلی دو آیات "﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾" "﴿الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ﴾" حمد و ثنا کے ضمن میں ایمان کے بنیادی اصول، اللہ تعالیٰ کا وجود اور اسکی توحید کا بیان بھی ایک معجزانہ انداز میں آگیا ہے۔ اس سورت کی تیسری آیت میں صرف دو لفظوں میں مَالِكِ يَوْمِ میں حمد و

ثنا کے ساتھ ساتھ اسلام کے عظیم الشان انقلاب والا عقیدہ بھی قیامت اور آخرت کا بیان بھی مع دلیل کے آگیا ہے۔

يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ -ایمان امن سے ہے (آمَنَ - يُؤْمِنُ = ایماناً)-بہ کے صلہ کے ساتھ آئے تو یقین کرنا۔ اعتماد کرنا ہوتا ہیں۔ اور لام کے صلہ سے آئے تو معنی ہونگے تصدیق کرنا۔

اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ - یعنی زندگی کے ہر شعبے میں خیال اور عمل اور برتاؤ کا وہ طریقہ بتا جو بالکل صحیح ہو جس میں غلط بینی اور غلط کاری اور بدانجامی کا خطرہ نہ ہو جس پر چل کر ہم سچی فلاح و سعادت حاصل کر سکیں۔ زندگی کے ان بے شمار پگڈنڈیوں کے درمیان فکر و عمل کی صحیح راہ سیدھی اور صاف شفّاف راہ کون سی ہے۔ اور اس راہ کی صحت یابی پر ہمارے دل کو مطمئن کر دے، اس پر چلنے کا ہمارے اندر ذوق اور شوق پیدا کر دے۔اس راہ کی مشکلیں ہم پر آسان کر دے ہمکو اس راہ سے بھٹکنے سے محفوظ رکھ الصراط پر لام عہد کا ہے اس سے مراد وہ سیدھا راستہ جو بندوں کے لیے خود خدا نے کھولا تھا۔

عبادت اور اطاعت

عبادت کے ساتھ اطاعت کا تعلق اس قدر گہرا ہے کہ بعض جگہ پر لفظ صاف صاف اطاعت کے مفہوم ہی کیلئے استعمال ہوتا ہے جیسے سورہ یٰس أَن لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ ۖ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ [یس: ٦٠] یہہ کہ تم شیطان کی عبادت مت کرو، کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

that you not worship Satan - [for] indeed, he is to you a clear enemy

اسطرح شیطان کی کوئی اطاعت کرتا ہے تو وہ عبادت ہی ہے اور اللہ کا حق، بندہ پر یہ ہے کہ بندہ تنہا اسی کی بندگی کرے اور اسی سے التجا کرے، بندے کا حق اللہ نے اپنے اوپر یہ بتلایا ہے کہ وہ اس پر رحمت نازل کرتا ہے اور اسکی مدد فرماتا ہے۔ اور بندے کا انداز نہایت مودبانہ ہونا چاہیے۔ بندہ اپنے کسی حق کی طرف اشارہ کرنے کے بجائے صرف اپنی احتیاج اپنے اعتماد اور اپنے آرزوؤں کا اظہار کرے کیونکہ بندہ کے شایان شان یہی ہے نہ کہ اپنا کوئی حق جتائے۔ یہ اللہ کا فضل وکرم ہے کہ وہ بندے کو بغیر کسی استحقاق کے سب کچھ بخشتا ہے۔ اور پھر اس فضل وکرم کو بندے کا حق قرار دیتا ہے۔

حدیث قدسی :- حضور اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے یہ الفاظ نقل فرماتے ہیں کہ جب بندہ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ پڑھتا ہے تو اللہ فرماتا ہے کہ یہ ٹکڑا میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے اور میں اپنے بندے کو وہ دیا جو اس نے مانگا۔ ہم تجھ ہی سے مانگنے کے الفاظ عام ہیں اس وجہ سے طلب مدد خاص عبادت کے معاملہ میں بھی ہو سکتا ہے اور زندگی کے دوسرے معاملہ میں بھی ہو سکتا ہے۔

عبادت میں بندہ خدا کی مدد کا محتاج، توفیق، رہنمائی اور استقامت کا محتاج ہوتا ہے۔ کیونکہ عبادت جبکہ وہ زندگی کے ہر پہلو اور زندگی کے ہر شعبہ میں خدا کی اطاعت پر بھی مشتمل جو ایک بڑی ہی آزمائش کی چیز ہے۔ اس میں بعض مرحلے سخت آجاتے ہیں جہاں پر بڑے بڑوں کے پیر ڈگمگاتے ہیں۔

عبادت کا لفظ بھی عربی میں تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ (۱) پوجا و پرستش (۲) اطاعت وفرمانبرداری (۳) بندگی اور غلامی۔ اس مقام پر تینوں معنی بیک وقت مراد ہیں۔ یعنی ہم تیرے پرستار بھی ہیں مطیع اور فرمانبردار بھی ہیں اور بندہ اور

غلام بھی اور واقعی حقیقت یہ ہے کہ ہمارا یہ تعلق صرف تیرے ہی ساتھ ہے اور ان تینوں معنی میں بھی کوئی دوسرا ہمارا معبود نہیں ہے۔

تیرے ساتھ ہمارا تعلق صرف عبادت ہی کا نہیں ہے بلکہ استعانت کا تعلق بھی تیرے ہی ساتھ رکھتے ہیں۔ ہم کو معلوم ہے کہ ساری کائنات کا ربّ تو ہی ہے اور ساری طاقتیں تیرے ہی ہاتھ میں ہیں اور ساری نعمتوں کا تو اکیلا ہی مالک ہے۔ اس لیے ہم اپنی حاجتوں میں تیری طرف ہی رجوع کرتے ہیں۔ تیرے ہی آگے ہمارے ہاتھ پھیلتے ہیں اور تیری مدد ہی پر ہمارا اعتماد ہے۔ اسی بناء پر ہم درخواست لیکر تیری خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں۔

عَانَ - يَعُوْنُ = عَوْنًا- مدد کرنا۔

اِسْتِعَانَ - يَسْتَعِينُ = اسْتِعانَةٌ مدد چاہتا۔

مذکورہ جملہ میں مفعول کی تقدیم نے حصر (تاکید) کا مفہوم پیدا کر دیا ہے یعنی عبادت بھی صرف خدا ہی کی اور استعانت بھی تنہا اُسی کی چنانچہ اس حصر نے بھی شرک کے تمام علائق کا ایک قلم خاتمہ کر دیا ہے۔ کیونکہ اس اعتراف کے بعد بندے کے پاس کسی غیر اللہ کیلئے کچھ دینے کو نہیں رہا اور نہ اس سے مانگنے کی کچھ گنجائش باقی رہی۔ اس آیت میں ایک اور بات بھی قابل غور ہے یعنی "ہم تجھ ہی سے مانگتے ہیں" کس سلسلے میں کس کام میں مدد مانگتے ہیں اسکا ذکر نہ کرنے میں عموم کی طرف اشارہ ہے کہ ہم عبادت میں ہر دینی کام میں اور ہر مقصد میں صرف آپ ہی کی مدد مانگتے ہیں۔

عبادت کس کا نام ہے؟

عبادت، صرف نماز روزے ہی کا نام نہیں ہے امام غزالی احمد نے اپنی کتاب "اربعین" میں عبادت کی قسمیں بتلائی ہیں۔

(۱) نماز (۲) زکوٰۃ (۳) روزہ (۴) حج (۵) تلاوت قرآن کریم (۶) دوام اللہ کا ذکر (۷) حلال روزی کی کوشش کرنا (۸) مسلمانوں کے، پڑوس اور ساتھیوں کے حقوق ادا کرنا (۹) لوگوں کو نیک اعمال کا حکم دینا اور اعمال بد سے منع کرنا۔ (۱۰) رسول خدا صلی اللہ وسلم کی سنتوں کی اتباع کرنا۔

اسلئے عبادت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنیکے معنی یہ ہونگے کہ نہ کسی کی محبت، اللہ کی محبت کے برابر ہو اور نہ کسی کا خوف اللہ کے خوف کے برابر ہو، نہ کسی سے امید اسطرح کی ہو جیسے اللہ سے امید رکھتے ہیں نہ کسی پر بھروسا اللہ پر بھروسا کے مثل ہو۔ نہ کسی کی اطاعت نہ کسی کی خدمت اور کام کو اتنا ضرور سمجھے جتنا اللہ تعالیٰ کی عبادت کو، نہ اللہ کے سوا کسی دوسرے کے سامنے اپنی مکمل عاجزی اور تذلُّل کا اظہار کرے اور نہ وہ افعال کرے جو انتہائی تذلُّل کی علامات ہیں جیسے سجدہ۔ رکوع وغیرہ

تحلیل ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ ﴿الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ﴾ ﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ﴾

الْحَمْد مبتدا، ال حرف جر، الله (مجرور) مبدل منہ، رَبّ مضاف، الْعَالَمِينَ مضاف الیہ، دونوں ملکر بدل اول، الرَّحْمَٰنِ، بدل ثانِ، الرَّحِيمِ بدل ثالث، مَالِكِ مضاف، يَوْمِ مضاف الیہ مضاف، الدِّينِ مضاف الیہ، سب ملکر بدل رابع،

اللہ مبدل منہ اپنے چار بدلوں سے ملکر مجرور، جار مجرور ملکر متعلق ہوا خبر محذوف حقٌّ کے، حقٌّ شبہ فعل اپنے فاعل اور متعلق سے ملکر شبہ جملہ ہو کر بتاویل مفرد خبر، مبتدا خبر ملکر جملہ اسمیہ خبریہ ہو کر ابتدائی ہوا۔

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ إِيَّاكَ: ضمیر منفصل، مفعول بہ مقدم،نعبد: فعل با فاعل، جملہ فعلیہ خبریہ ہوکر معطوف علیہ ہوا،وَاو عاطفہ،إِيَّاكَ ضمیر منفصل، مفعول بہ مقدم،نَسْتَعِينُ : فعل با فاعل، جملہ فعلیہ خبریہ ہوکر معطوف، معطوف علیہ اور معطوف ملکر جملہ فعلیہ خبریہ ہوکر مستانفہ ہوا۔

﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ اهْدِ فعل با فاعل، نا : مفعول بہ ، اول،الصِّرَاطَ موصوف،الْمُسْتَقِيمَ: صفت، موصوف صفت ملکر مبدل منہ (مفعول ثانی)

﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾

صِرَاطَ : مضاف،الَّذِينَ : اسم موصول،أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ : جملہ فعلیہ خبریہ ہوکر صلہ ہوا، اسم موصول اور صلہ ملکر مضاف الیہ۔ مضاف مضاف الیہ ملکر بدل اول۔ غَيْرِ مضاف، الْمَغْضُوبِ (اسم مفعول) شبہ فعل،عَلَيْهِمْ جار مجرور ملکر متعلق شبہ فعل، شبہ فعل اپنے نائب فاعل اور متعلق سے ملکر شبہ جملہ ہوکر مضاف الیہ مضاف، مضاف الیہ ملکر معطوف علیہ، واو عاطفۃ، لا زائدہ،الضَّالِّينَ : جملہ ہوکر معطوف، معطوف علیہ اور معطوف ملکر مضاف الیہ، مضاف مضاف الیہ ملکر بدل ثانی۔ مبدل منہ ، اپنے دونوں بدلوں سے ملکر مفعول ثانی ہوا، فعل اِهْدِنَا کا،اِهْدِنَا فعل اپنے فاعل اور دو مفعولوں سے ملکر جملہ انشائیہ ہوا۔

لفظ قرآن کی لغوی تعریف

اس سلسلہ میں دو باتیں کہی گئی ہیں اور دونوں ہی قرین قیاس ہیں۔ایک یہ کہ قرآن قراءت سے ماخوذ ہے۔ قَرَإ - يَقْرَأُ = قِرَاءَةً -قُرْآناً اور قرآن کے معنی خوب پڑھے جانے والی کتاب ، بار بار پڑھی جانے والی کتاب۔ اور دوسری رائے یہ ہے کہ

قرآن کا مادہ ، ق - ر-ن سے ہے۔ اسکے معنی ملنے اور جوڑنے کے ہیں۔ چونکہ قرآن، باہم مربوط اور معنوی اعتبار سے ہم آہنگ کلام ہے اس لئے اس کو قرآن کہتے ہیں۔

﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾: (۱) ہم کو سیدھے راستہ کی ہدایت بخش (۲) بتلا ہم کو سیدھا راستہ (۳) ہم کو سیدھا راستہ دیکھا۔

اهْدِنَا کا مطلب صرف اسی قدر نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم اس سے بہت زیادہ ہے۔ اس میں یہ مفہوم بھی ہے کہ اس راستے کی صحت ہونے پر ہمارے دل مطمئن کر دے۔ اور اس پر چلنے کا ہمارے اندر ذوق و شوق پیدا کر دے۔ اسکی مشکلیں ہمارے لئے آسان کر دے اور اس پر چلا دینے کے بعد دوسری پگڈنڈیوں پر بھٹکنے سے محفوظ رکھ۔ یہ سارا مضمون یہاں صلہ (الیٰ) کو محذوف کر دینے سے پیدا ہوتا ہے۔ صراط مستقیم کی ہدایت کیلئے دعا کی جو تعلیم فرمائی گئی ہے۔ اسکے مخاطب جس طرح انسان اور تمام عامّۃُالمؤمنین ہیں اُسی طرح اولیاء اللہ اور حضرات انبیاء علیہم السلام بھی اسکے مامور ہیں۔ جو بلا شبہ ہدایت یافتہ بلکہ دوسروں کیلئے ہدایت کا سر چشمہ ہیں پھر اس حاصل شدہ چیز کی بار بار دعا مانگنے کا کیا مطلب ہوا؟

اسکا جواب ہدایت کی پوری حقیقت کو معلوم کرنے پر موقوف ہے۔ اسکی بہترین تشریح امام راغب اصفہانی رحمہ نے مفردات القرآن میں تحریر فرمائی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہدایت کے اصل معنی ہیں کسی شخص کو منزل کی طرف مہربانی کے ساتھ رہنمائی کرنا، اور ہدایت کرنا حقیقی معنی میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کا فعل ہے۔ اسکے مختلف درجات ہیں۔ ایک درجہ ہدایت کا عام ہے جو کائنات و مخلوقات

کی تمام اقسام، جمادات، نباتات، حیوانات وغیرہ کو شامل ہے یہاں آپ یہ خیال نہ کریں کہ ان بے جان اور بے شعور چیزوں کو ہدایت سے کیا کام ؟

قرآن کی تعلیمات سے یہ بات واضح ہے کہ کائنات کی تمام اقسام اور ان کا ذرہ ذرہ اپنے اپنے درجے کے موافق، حیات اور احساس بھی رکھتا ہے اور عقل و شعور بھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ جوہر کسی نوع میں زیادہ تو کسی میں کم ہے۔ جن اشیاء میں یہ جوہر کم ہے ان کو بے جان اور بے شعور سمجھا اور کہا جاتا ہے۔ احکام الٰہی میں بھی انکے ضعف شعور کا اتنا اثر آیا ہے کہ انکو احکام کا مکلّف نہیں بنایا گیا۔ حیات کے آثار تو ہیں لیکن عقل اور شعور نمایاں نہیں۔ انکو ذی حیات جاندار مگر بے عقل و شعور کہا جاتا ہے اور جس میں حیات کے ساتھ عقل و شعور کے آثار بھی نمایاں نظر آتے ہیں انکو ذوی العقول کہا جاتا ہے۔ اسی اختلاف درجات اور عقل و شعور کی کمی بیشی کی وجہ سے تمام کائنات میں احکام شرعیہ کا مکلّف صرف انسان اور جنّات کو قرار دیا گیا ہے کہ ان میں عقل و شعور مکمل ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دوسرے انواع اور اقسام میں حیات و احساس یا عقل و شعور بالکل نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے

﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَاوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ ۚ وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَٰكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ ۗ إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا﴾ [الإسراء: ۴۴] ساتوں آسمان اور زمین اور جو لوگ ان میں ہیں سب اسی کی تسبیح کرتے ہیں۔ اور (مخلوقات میں سے) کوئی چیز نہیں مگر اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے۔ لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔ بے شک وہ بردبار (اور) غفار ہے۔

﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُسَبِّحُ لَهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالطَّيْرُ صَافَّاتٍ ۖ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ﴾ [النور: ۴۱]

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو لوگ آسمانوں اور زمین میں ہیں خدا کی تسبیح کرتے ہیں اور پر پھیلائے ہوئے جانور بھی۔ اور سب اپنی نماز اور تسبیح کے طریقے سے واقف ہیں۔ اور جو کچھ وہ کرتے ہیں (سب) خدا کو معلوم ہے۔

اللہ کی معرفت ہی سب سے بڑا علم ہے:-

ظاہر ہے کہ اللہ کی معرفت ہی سب سے بڑا علم ہے۔ اللہ کی حمد و ثنا بیان کرنا اور اسکی پاکی بیان کرنا اللہ کی معرفت ہی پر مبنی ہے اور علم بغیر عقل اور شعور کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ مذکورہ آیات سے ثابت ہوا کہ کائنات کے اندر روح اور حیات بھی ہے ادراک اور احساس بھی ہے، عقل و شعور بھی۔

مگر بعض کائنات میں یہ جوہر اس قدر کم اور پوشیدہ ہے کہ عام دیکھنے والوں کو اس کا احساس نہیں ہوتا اسلئے عرف میں ان کو بے جان یا بے عمل کہا جاتا ہے اور اسی بناء پر انکو احکام شرعیہ کا مکلّف نہیں بنایا گیا۔

سب کو فطری ہدایت

اللہ نے خلقت کی مناسبت سے ساری مخلوق کو ہدایت عطا کی ﴿قَالَ رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ﴾[طه: ٥٠] کہا کہ ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی شکل و صورت بخشی پھر راہ دکھائی۔ الغرض ہدایت خداوندی کا یہ درجہ اولی تمام مخلوقات جمادات، نباتات انسان اور جن کو شامل ہے۔ یہی مضمون سورہ اعلا میں بھی ہے۔ ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى﴾﴿الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّىٰ﴾﴿وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ﴾

(اے پیغمبر) اپنے پروردگار جلیل الشان کے نام کی تسبیح کرو، جس نے (انسان کو) بنایا پھر (اس کے اعضاء کو) درست کیا اور جس نے (اس کا) اندازہ ٹھہرایا (پھر اس کو) ہدایت دی۔

یعنی جس نے تمام مخلوقات کیلئے خاص خاص مزاج اور خاص خاص خدمتیں تجویز فرما کر ہر ایک کو اسکے مطابق ہدایت دی۔ اس ہدایت عامہ کا نتیجہ ہے کہ تمام کائنات کے تمام انواع و اصناف اپنا اپنا مقرر فرض نہایت سلیقہ سے ادا کر رہے ہیں جو چیز جس کام کے لئے بنادی ہے وہ اُس کو اسی خوبی کے ساتھ ادا کر رہی ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ جو مولانا رومی رحمہ فرماتے ہیں۔

باد و خاک و آب و آتش بندہ اند
با من و تو مردہ با حق زندہ اند

Air and earth and water and fire are (His) slaves: with you and me they are dead, but with God they are alive.

زبان سے نکلے ہوئی آواز کے معنی کا ادراک نہ ناک کر سکتی ہے نہ آنکھ حالانکہ یہ زبان سے زیادہ قریب ہیں اس ادراک کا فریضہ اللہ نے کانوں کے سپرد کر دیا ہے وہ زبان کی بات کو سمجھتے ہیں۔

مولانا جلال الدین رومی رحمہ نے فرمایا۔

محرم این ہوش جز بے ہوش نیست
مر زبان را مشتری جز گوش نیست

اس ہوش کا رازداں بے ہوش کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے زبان کا خریدار کان جیسا کوئی نہیں ہے۔

اس طرح کانوں سے دیکھنے یا سونگھنے کا کام نہیں کیا جاسکتا ناک سے سننے یا دیکھنے کا کام نہیں لیا جاسکتا۔ سورہ مریم میں اس مضمون کو بیان کیا گیا ہے۔

﴿إِن كُلُّ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمَٰنِ عَبْدًا﴾ [مریم: ٩٣] تمام شخص جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سب خدا کے روبرو بندے ہو کر آئیں گے۔

ہدایت کا دوسرا درجہ : ہدایت کا دوسرا درجہ پہلے کے مقابلہ میں خاص ہے یعنی یہ صرف ان لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے جو ذوی العُقُول کہلاتے ہیں یعنی انسان اور جن۔ یہ ہدایت انبیاء اور آسمانی کتابوں کے ذریعے ہر انسان کو پہنچتی ہے۔ پھر کوئی اسکو قبول کر کے مسلمان ہو جاتا ہے اور کوئی رد کر کے کافر۔

تیسرا درجہ ہدایت : تیسرا درجہ ہدایت کا اس لیے بھی خاص ہے یعنی صرف مومنین اور محققین کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ ہدایت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلا واسط انسان پر خاص ہوتی ہے اس ہدایت کا دوسرا نام توفیق ہے۔ یعنی ایسے اسباب اور حالات کو پیدا کرنا کہ ہدایت کا قبول کرنا اور اُن ہدایات پر عمل کرنا آسان ہو جائے اور انکی خلاف ورزی دشوار ہو جائے۔ اس تیسرے درجہ کی وسعت غیر محدود اور اسکے درجات غیر متناہی ہیں۔ یہی درجہ انسان کی ترقی کا میدان ہے۔ اعمال صالح کے ساتھ ساتھ اس درجے میں ہدایت کے اعتبار سے ترقی ہوتی ہے۔ کہ قرآن کریم کی متعدد آیات میں اس زیادتی ہدایت کا ذکر ہے۔

﴿وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ﴾ [محمد: ١٧]

اور جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں ان کو وہ ہدایت مزید بخشتا اور پرہیزگاری عنایت کرتا ہے۔

﴿وَمَن يُؤْمِن بِاللَّهِ يَهْدِ قَلْبَهُ ۚ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ [التغابن: ١١]

اور جو شخص خدا پر ایمان لاتا ہے وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔ اور خدا ہر چیز سے باخبر ہے۔

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ﴾ [العنكبوت: ٦٩]

اور جن لوگوں نے ہمارے لئے کوشش کی ہم اُن کو ضرور اپنے رستے دکھا دیں گے۔ اور خدا تو نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔

یہی وہ میدان ہے جہاں بڑے سے بڑا، نبی و رسول اور ولی اللہ آخر عمر تک زیادتی ہدایت اور توفیق کا طالب نظر آتا ہے۔ درجات ہدایت کی اس تشریح سے سمجھ گیے ہونگے کہ ہدایت ایک ایسی چیز ہے جو سب کو حاصل بھی ہے۔ اور اس کے مزید درجات حاصل کرنے سے کسی بڑے سے بڑے انسان کو استغناء بھی نہیں ہے اسلئے سورہ فاتحہ کی اہم ترین دعا ہدایت کو قرار دیا گیا ہے۔ جو ایک ادنی مومن کیلئے بھی مناسب حال ہے اور بڑے سے بڑے رسول کیلئے بھی اتنی ہی اہم ہے۔

ہدایت کی اس تشریح سے ہم کو فہم قرآن میں بہت سے فوائد ہونگے۔ ایک تو یہ کہ ہدایت کو کل مخلوقات کیلے عام فرما دیا گیا، کیا مؤمن، کیا کافری اور کہیں اسکو متقین کے ساتھ مخصوص کر دیا گیا۔ (اسطرح ایک درجہ عام ہے اور دوسرا مخصوص ہے۔) ہدایت کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ وہ ظالمین اور فاسقین کو نصیب نہیں ہوتا۔

﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ﴾

[القصص: ٥٦] (اے محمد ﷺ) تم جس کو دوست رکھتے ہو اُسے ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ خدا ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور وہ ہدایت پانیوالوں کو خوب جانتا ہے۔

الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کون سا راستہ ہے

صراط المستقیم سے مراد دین کا وہ راستہ ہے جس میں افراط اور تفریط نہ ہو پھر بعد کی آیت میں صراط مستقیم کی تشریح کی گئی ہے۔

صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (راستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا) ان کی تفصیل ایک دوسری جگہ اسطرح آتی ہے۔

﴿وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ ۚ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا﴾ [النساء: ٦٩]

اور جو لوگ خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں وہ (قیامت کے روز) ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر خدا نے بڑا فضل کیا یعنی انبیاء اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ اور ان لوگوں کی رفاقت بہت ہی خوب ہے

مذکورہ آیت میں مقبولین کے بارگاہ الٰہی کے چار درجات ہیں۔ جن میں سب سے اعلیٰ انبیاء علیہم السلام ہیں اور صدیقین وہ لوگ ہیں جو انبیاء کی اُمّت میں سب سے زیادہ رتبے کے ہوتے ہیں جن میں کمالات باطنی بھی ہوتے ہیں، عرف میں انکو اولیاء کہتے ہیں اور شھداء وہ لوگ ہیں جنھوں نے دین کی محبت میں اپنی جان تک دے دی ہو اور صلحاء وہ ہیں جو شریعت کے پورے متبع

ہوتے ہیں۔ واجبات میں بھی، مستحبات میں بھی، جن کو عرف میں نیک اور دین دار کہا جاتا ہے۔ ان چار طبقوں کے حضرات جس راستے پر چلیں وہ صراط مستقیم ہے

یہ اس سیدھے راستے کی تعریف ہے جس کا علم ہم اللہ سے مانگ رہے ہیں۔ یعنی وہ راستہ جس پر تیرے منظور نظر لوگ ہمیشہ سے ملتے رہے ہیں۔ یہ وہ بے خطا راستہ کہ قدیم ترین زمانے سے آج تک جو شخص اور جو جماعت بھی چلی ہے وہ تیرے انعامات کے مستحق ہوئے اور تیری نعمتو سے مالا مال ہو کر رہے۔

نوٹ :- انعام پانیوالوں سے ہماری مراد وہ لوگ نہیں ہیں جو بظاہر عارضی طور پر تیری دنیوی نعمتوں سے سرفراز ہوتے ہیں مگر دراصل وہ تیرے عذاب کے مستحق ہوا کرتے ہیں اور وہ اپنی فلاح اور سعادت کی راہ گم کیے ہوئے ہوتے ہیں۔

اس تشریح سے یہ بات بخود کھل جاتی ہے کہ انعام سے مراد حقیقی اور پائیدار انعامات ہیں جو درست روی اور خدا کی خوشنودی کے نتیجے میں ملا کرتے ہیں نہ کہ وہ عارضی اور نمائشی انعامات جو پہلے بھی فرعونوں اور نمرودوں اور قارونوں کو ملتے رہے ہیں اور آج بھی ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے ظالموں اور بد کاروں اور گمراہوں کو ملے ہوئے ہیں۔

چونکہ دنیا میں صراط المستقیم کا پہچاننا ہی سب سے بڑا علم ہے۔
اور بڑی کامیابی ہے اور اسی کی پہچان میں غلطی ہونے سے اقوام عالم تباہ ہو جاتی ہے۔ ورنہ خدا طلبی اور اسے کے لیے مجاہدات کی تو بہت سے کفار میں بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ اس لئے قرآن نے صراط مستقیم کو پوری وضاحت کے ساتھ مثبت اور منفی پہلوؤں سے واضح فرمایا ہے۔

صراط رسول یا صراط قرآن کیوں نہیں کہا گیا؟

کیونکہ پورا قرآن کریم در اصل صراط المستقیم کی ہی تشریح ہے اسی طرح پوری تعلیمات رسول بھی۔ یعنی قرآن کریم اس جگہ یہ نہیں فرمایا کہ قرآن کا راستہ اختیار کرو یا یہ نہیں فرمایا کہ رسول صلعم کا راستہ اختیار کرو۔ قرآن کو اختیار کرو اس لئے نہیں فرمایا کیونکہ محض کتاب انسانی تربیت کیلئے کافی نہیں ہے۔ اور رسول کے بارے میں اس لئے نہیں فرمایا کہ رسول ﷺ کی بقاء اس دنیا میں دائمی نہیں ہے۔ اور آپکے بعد کوئی دوسرا رسول آنیوالا نہیں ہے۔

اسلئے صراط مستقیم جن لوگوں کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے ان میں انبیا کے علاوہ ایسے حضرات بھی شامل کر دیے گئے ہیں جو تا قیامت ہمیشہ موجود رہیں گے۔ مثلاً صدیقین، شہدا اور صالحین - خلاصہ یہ ہے کہ سیدھا راستہ معلوم کرنے کیلئے حق تعالیٰ نے کچھ رجال اور انسانوں کا پتہ دیا ہے۔

حدیث : رسول ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کو خبر دی اور ارشاد فرمایا کہ پچھلی امتوں کی طرح میری اُمّت میں بھی تہتر (۷۳) فرقے ہونگے اور صرف ایک جماعت ہی ان میں حق پر ہو گی تو صحابہ نے دریافت کیا کہ وہ کونسی جماعت ہے ؟ اس پر حضور ﷺ نے جواب دیا اس میں بھی کچھ رجال اللہ (یعنی اللہ والوں) ہی کا پتہ دیا ہے، فرمایا مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي - (یعنی حق پر وہ جماعت ہو گی جو میرے اور میرے صحابہ کے طرز پر ہو۔

اس خاص طرز میں شاید اس طرف بھی اشارہ ہے کہ انسان کی تعلیم و تربیت محض کتابوں اور روایات سے نہیں ہو سکتی صالحین اور ماہرین کی صحبت سے اور ان سے سیکھ کر حاصل کر سکتے ہیں۔ یعنی در حقیقت انسان کا معلم انسان ہی ہو سکتا ہے۔

اگر کتاب کافی ہوتی تو رسول کی ضرورت نہ ہوتی

اگر کتاب ہی کافی ہو جاتی ہدایت کیلیے تو رسول کی کیا ضرورت تھی؟ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو دنیا کے تمام کاروبار میں مشاہدہ ہے کہ محض کتابی تعلیم سے نہ کوئی کپڑا سیا سیکھ سکتا ہے نہ کھانا پکانا، نہ ڈاکٹری کی کتاب پڑھ کر ڈاکٹر بن سکتا ہے، نہ انجنیئرنگ کی کتابوں کے محض مطالبے سے کوئی انجنیئر بنتا ہے۔

اس طرح قرآن اور حدیث کا محض مطالعہ انسان کی تعلیم اور اخلاقی تربیت کیلیے ہر گز کافی نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اسکو کسی محقق ماہر سے باقاعدہ حاصل نہ کیا جائے۔ قرآن اور حدیث کے معاملے میں بہت لکھے پڑھے لوگ اس مغالطہ میں مبتلا ہیں کہ محض ترجمے یا تفسیر دیکھ کر وہ قرآن کے ماہر ہو سکتے ہیں یہ تصور بالکل فطرت کے خلاف ہے۔

اگر محض کتاب کافی ہوتی تو رسولوں کے بھیجنے کی ضرورت نہ تھی۔ کتاب کے ساتھ رسول کو معلم بنا کر بھیجنا اور صراط مستقیم کو متعین کرنیکے لیے اپنے مقبول بندوں کی فہرست دینا اس بات کی دلیل ہے کہ محض کتاب کا مطالعہ تعلیم و تربیت کیلیے ناکافی ہے۔ بلکہ کسی ماہر سے سیکھنے کی ضرورت ہے۔ معلوم ہوا کہ انسان کی اصلاح اور فلاح کیلیے دو چیزیں ضروری ہیں۔ کتاب اللہ جس میں زندگی کے ہر شعبے سے متعلق احکام موجود ہوں دوسرے رجال اللہ یعنی اللہ والے لوگ۔ ان سے استفادہ کی صورت یہ ہے کہ کتاب اللہ کے معروف اصولوں پر رجال اللہ کو پرکھا جائے اور جو اس معیار پر نہ اتریں انکو رجال اللہ نہ سمجھا جائے۔

فرقہ وارانہ اختلافات کا سبب

یہی ہے کہ کچھ لوگوں نے صرف کتاب اللہ کو لے لیااور رجائی اللہ سے قطع نظر کر لی۔ انکی تفسیر و تعلیم کو کوئی اہمیت اور کوئی حیثیت نہیں دیا۔ اور کچھ لوگوں نے صرف رجال اللہ کو معیار حق سمجھ لیا۔ اور کتاب اللہ سے آنکھ بند کر لی۔ ان دونوں طریقوں کا نتیجہ گمراہی ہے۔

سورہ فاتحہ کے متعلق احکام و مسائل

سورہ فاتحہ میں پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہے پھر صرف اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کا اقرار ہے۔ اور اس کا اظہار ہے کہ اسکے سوا کسی کو اپنا حاجت رواں نہیں سمجھتے۔ یہ گویا حلف وفا داری ہے جو انسان اپنے رب کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کے بعد پھر ایک اہم دعا ہے جو تمام انسانی مقاصد و ضروریات پر حاوی ہے۔ اور اس میں بہت سے فضائل اور مسائل ضمنی آئے ہیں یہاں اہم باتوں کو اجمالاً بیان کیا جاتا ہے۔

دعا کرنے کا طریقہ : اس خاص اسلوب کلام کے ذریعے انسان کو یہہ تعلیم دیگئی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ سے دعا کرو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اسکی حمد و ثنا کا فرض بجا لا کر پھر حلف وفاداری اسبات کا کرو کہ اسکے سوا نہ کسی کو لائق عبادت سمجھتے ہیں اور نہ کسی کو حقیقی معنی میں مشکل کشا اور حاجت روا مانتے ہیں۔ اسکے بعد اپنے مطلب کی دعا کرو۔ اس طریقہ سے جو دعا کی جائیگی وہ قبول ہونیکی امید ہے۔

دعا میں بھی ایسی جامع دعا اختیار کرو جس میں اختصار کے ساتھ انسان کے تمام مقاصد داخل ہو جائیں جیسے ہدایت صراط مستقیم کہ دین و دنیا کے ہر کام میں اگر انسان کا راستہ سیدھا ہو جائے تو کہیں ٹھوکر لگنے اور نقصان پہنچنے کا خطرہ

نہیں رہتا غرض اس جگہ خود اللہ اپنی طرف سے اپنی حمد و ثنا بیان کرنے کا اصل مقصد انسان کو تعلیم دینا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا انسان کا فطری فرض ہے۔

سورت کے پہلے جملے میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرنے کی تعلیم و ترغیب ہے مگر حمد کسی نعمت یا صفت کی بناء پر ہوا کرتی ہے لیکن یہاں کسی نعمت یا صفت کا ذکر نہیں۔ اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بے شمار ہیں ان کا کوئی انسان احاطہ نہیں کر سکتا جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے سورہ نحل ﴿وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا﴾ اگر تم خدا کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو گن نہ سکو۔

انسان اگر سارے عالم کو چھوڑ کر خود اپنے وجود پر نظر ڈالے تو معلوم ہو گا کہ اس کا وجود خود ایک عالم اصغر ہے۔ جس میں عالم اکبر کے سارے نمونے موجود ہیں۔ اسکا بدن زمین کی مثال ہے، اس پر اگنے والے بال نباتات جیسے اور اسکی ہڈیاں پہاڑوں کی شبیہ ہے۔ اسکے بدن کی رگیں جن میں خون رواں ہے، زمین کے نیچے بہنے والے چشموں اور نہروں کی مثال ہے۔

انسان روح اور جسم سے مرکب ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ قدر و قیمت کے اعتبار سے روح اصل، اعلیٰ اور افصل ہے۔ بدن اسکے تابع ہے اور کم درجہ رکھتا ہے۔ اس ادنی جز کے متعلق بدن انسان کی تحقیق کرنے والے اطباء (طبیب) اور اہل تشریح نے بتلایا کہ اس میں اللہ نے تقریباً پانچ ہزار مصالح اور منافع رکھے ہیں۔ اسکے بدن میں (۳۰۰) سے زیادہ جوڑیں ہیں ہر ایک جوڑ کو اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ نے

ایسا مستحکم بنایا ہے کہ ہر وقت کی حرکت کے باوجود نہ وہ گھستا ہے نہ اسکی مرمت کی ضرورت پڑتی ہے۔

عادۃً انسان کی عمر ۶۰ سے ۷۰ سال ہوتی ہے۔ پوری عمر اسکے یہ نرم و نازک اعضاء اور ان کے سب جوڑ اکثر اوقات اسطرح حرکت میں رہتے ہیں کہ اگر فولاد بھی ہوتا تو وہ گھس جاتا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا سورہ دھر میں ﴿ نَّحْنُ خَلَقْنَاهُمْ وَشَدَدْنَا أَسْرَهُمْ ۖ وَإِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَا أَمْثَالَهُمْ تَبْدِيلًا ﴾ ہم نے انکو پیدا کیا اور ان کے مفاصل کو مضبوط بنایا اور اگر ہم چاہیں تو ان کے بدلے ان ہی طرح کے اور لوگ لے آئیں۔ عام عادت کے مطابق یہہ نرم و نازک جوڑ ستر برس تک کام دیتے ہیں۔ انسانی اعضاء میں سے صرف آنکھ ہی کو لو اس میں اللہ کی حکمت کے مظاہر موجود ہیں۔ انسان اپنی پوری عمر لگا کر بھی ان کا پورا ادراک کرنا آسان نہیں ہے۔

ایک منٹ کے عمل میں کیا کیا ہوتا ہے؟

آنکھ اُٹھی کسی چیز کو دیکھی کیونکہ آفتاب کی روشنی موجود ہے۔ اور آنکھ کو کام میں لانے کیلئے غذا اور ہوا وغیرہ کی ضرورت ہے۔ اسطرح ایک مرتبہ کے دیکھنے میں پوری عالم کی طاقتیں کام کر رہی ہیں۔ پھر یہ عمل دن میں سووں مرتبہ ہوتا ہے۔ اس طرح کان، زبان ہاتھ پاوں کے جتنے کام ہیں ان سب میں پورے عالم کی قوتیں کام کر رہی ہیں۔ اور یہ وہ نعمت ہے جو ہر انسان کو میسر ہے اس میں شاہ و گرد، امیر غریب کا کوئی امتیاز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی نعمتیں ہیں اور وہ سب وقف عام ہیں کہ ہر فرد انسانی ان سے نفع اٹھاتا ہے۔ آسمان و زمین ان دونوں میں اور ان کے درمیان پیدا ہونے والی تمام کائنات چاند، سورج ثوابت و سیارے، ہوا،

فضاء وغیرہ۔ان نعمتوں سے ہٹ کر اللہ انسان کے افراد میں بتقاضائے حکمت کم و پیش کر کے عطا ہوتی ہے مال اور عزت، جاہ واقتدار، راحت وآرام، وغیرہ ہیں۔

بر حال یہ ایک سر سری نمونہ ہے ان نعمتوں کا جو ہر انسان پر ہر وقت میسر ہیں۔ ایسی صورتحال میں لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ہر انسان اپنی زندگی بھر ان احسانات اور انعامات کرنے والے کی حمد و ثنا کرے۔اور کرتا رہے اسی کے تقاضائے فطرت کی تلقین کیلئے قرآن کی سب سے پہلی سورت کا سب سے پہلا کلمہ الحمد لایا گیا ہے۔ اور اللہ کی حمد و ثنا کو عبادت میں بڑا درجہ دیا گیا ہے۔

حدیث :- جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو کوئی نعمت عطا فرمائے اور وہ اس پر الْحَمْدُ لِلَّه کہے تو ایسا ہو گیا کہ گویا جو کچھ اس نے لیا تھا اس سے افضل چیز دے دی۔

حدیث :-اگر ساری دنیا کی نعمتیں کسی ایک شخص کو حاصل ہو جائیں اور وہ اس پر الْحَمْدُ لِلَّه کہہ لے تو یہ کہنا بھی اللہ ہی کی ایک نعمت ہے اور یہ نعمت ساری دنیا کی نعمتوں کے افضل ہے۔

حدیث :-الْحَمْدُ لِلَّه سے میزان عمل کا آدھا پلہ بھر جاتا ہے۔

حمد کی حقیقت کیا ہے۔

حضرت شقیق بن ابراہیم رحمہ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ تمکو کوئی چیز عطا کرتا ہے تو اوّل اسکے دینے والے کو پہچانو پھر جو کچھ کس نے دیا ہے اس پر راضی ہو جاؤ پھر جب تک تمہارے جسم میں اسکی عطا کی ہوئی قوت و طاقت موجود ہے اسکی نافرمانی کے قریب مت جاؤ۔

لِلّٰہِ یہ دوسرا کلمہ ہے کہ لفظ اللہ کے شروع میں حرف لام لگا ہوا ہے جس کو عربیت کے قاعدے سے لام اختصاص کہا جاتا ہے۔ جو کسی وصف کی خصوصیت پر دلالت کرتا ہے۔ اس جگہ معنی یہ ہیں کہ صرف یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا انسان کا فرض ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حمد و ثنا صرف اسی کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے۔ حقیقی طور پر اس عالم میں کوئی مستحق حمد و ثنا کا نہیں ہو سکتا۔ اسکے ساتھ یہ بھی اسکا انعام ہے کہ انسان کو تہذیب اور اخلاق سکھانے کے لیے بندے کو یہ حکم بھی دے دیا کہ میری نعمت اور احسان جن واسطوں سے تمہارے ہاتھ آئے ان کا بھی شکر ادا کرو کیونکہ جو شخص اپنے محسن انسان کا شکر ادا کرنے کا عادی نہ ہو وہ خدا کا بھی شکر ادا نہیں کریگا۔

خود اپنی مدح اور ثنا کسی انسان کیلئے جائز نہیں ہے۔

خود اپنی مدح و ثنا کا بیان کرنا صرف اللہ تعالیٰ ہی کی خصوصیت ہے۔ کسی مخلوق کے لیے جائز نہیں کہ اپنی تعریف آپ کیا کرے۔ قرآن فرماتا ہے سورہ نجم ۳۲

﴿فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ ۖ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ﴾ تم اپنے آپ کو پاک وصاف نہ جتاؤ۔ جو پرہیز گار ہے وہ اس سے خوب واقف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کی تعریف اور مدح کا مدار تقوے پر ہے اور اس کا حال اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے کہ کس کا تقویٰ کس درجہ کا ہے۔

اور حق تعالیٰ کا اپنی حمد و ثنا بیان کرنے کا مقصد بھی یہ ہے کہ بیچارہ انسان اسکی استعداد نہیں رکھتا کہ وہ بارگاہ عزت اور جلال کی حمد و ثنا کیسے بیان کرے۔ اور کسی کی مجال نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے شایان شان حمد و ثنا کر سکے۔

حدیث: میں آپکی ثنا کماحقہ نہیں کر سکتا۔

اسلئے اللہ تعالیٰ نے خود ہی حمد و ثنا کا طریقہ، انسان کو تعلیم فرمادیا۔

لفظ رب اللہ تعالیٰ کا خاص نام ہے۔

غیر اللہ کو رب کہنا جائز نہیں ہے۔ لفظ رب ایسے شخص کیلئے بولا جاتا ہے جو کسی چیز کا مالک ہو اور اسکی تربیت اور اصلاح کی تدبیر اور پوری نگرانی بھی کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ ساری کائنات و مخلوقات کا ایسا رَبّ سوائے خدا تعالیٰ کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اسلئے یہ لفظ حق تعالیٰ کیلئے خاص ہے۔ صحیح مسلم کی حدیث میں اسکی ممانعت آئی ہے کہ کوئی غلام یا نوکر اپنے آقا کو رب کہے۔ البتہ کسی خاص چیز کی طرف اضافت کر کے انسان وغیرہ کے لئے بھی یہ لفظ بولا جا سکتا ہے۔ مثلاً رب المال۔

عبد اللہ بن عباس نے فرمایا کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ بعض سلف صالحین نے فرمایا کہ سورہ فاتحہ پورے قرآن کا خلاصہ ہے کیونکہ اسکے پہلے جملے میں شرک سے بری ہونے کا اعلان ہے اور دوسرے جملے میں اپنی قوت اور قدرت سے بری ہونے کا اقرار ہے۔ بندہ عاجز بغیر اللہ کی مدد کے کچھ نہیں کر سکتا۔ نتیجتاً اپنے سارے کاموں کو اللہ ہی کے سپرد کرتا ہے۔ جسکی ہدایت قرآن میں جابجا ہے۔

فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ [هود: ١٢٣]

قُلْ هُوَ الرَّحْمَٰنُ آمَنَّا بِهِ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا [الملك: ٢٩]

رَّبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا [المزمل: ٩]

مذکورہ سارے آیات کا حاصل یہی ہے کہ مؤمن اپنے ہر عمل میں اعتماد اور بھروسا نہ اپنی قابلیت پر کرے نہ کبھی دوسرے کی مدد پر، بلکہ کلی اعتماد صرف اللہ تعالیٰ ہی پر ہونا چاہیے۔ وہی کارساز مطلق ہے۔

حلال اور حرام کسی چیز کو ٹھیرانے کا حق صرف اللہ ہی کی ہے۔

جو شخص اس میں کسی کو شریک ٹھراے اور اللہ تعالیٰ کے احکام حلال اور حرام معلوم ہونے کے باوجود ان کے خلاف کسی قول کو واجب الاتباع سمجھے وہ گویا اسکی عبادت کرتا ہے اور شرک میں مبتلا ہے۔

نوٹ :۔ جس طرح احکام حلال اور حرام میں اللہ کے سوا کسی کو شریک کرنا شرک ہے اسی طرح کسی نام کی نذر و منت مانگنا بھی شرک میں داخل ہے۔ اللہ کے سوا کسی دوسرے کو حاجت روا یا مشکل کشا سمجھ کر اس سے دعا مانگنا بھی شرک ہے۔ کیونکہ حدیث میں دعا کو عبادت فرمایا گیا ہے۔

کسی کو رکوع سجدہ کرنا، بیت اللہ کے سوا کسی دوسرے پیر کے گرد طواف کرنا یہ سب علامات شرک ہیں۔ معجزات، اور کرامات براہ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے صرف اسکا ظہور پیغمبر یا ولی کے ہاتھوں پر انکی عظمت ظاہر کرنیکے لیے کیا جاتا ہے۔ پیغمبر یا ولی کا اسکے وجود میں آنے میں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ قرآن کریم کی بے شمار آیات اس پر شاہد ہیں۔ جیسے سورہ انفال ١٧ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَـٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (اے محمد جس وقت تم نے کنکریاں پھینکیں تھیں وہ تم نے نہیں پھینکیں تھیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکیں تھیں)

اس سے معلوم ہوا کہ معجزہ جو نبی کے ہاتھوں سے ہوتا ہے وہ درحقیقت اللہ کا فعل ہوتا ہے۔ وسیلہ، استعانت کے مسئلے میں جان لیں کہ انبیاء، اولیاء کو وسیلہ بنانا نہ مطلّقاً جائز ہے اور نہ مطلّقاً ناجائز۔ اگر کسی کو مختار مطلق سمجھ کر اسکو وسیلہ بنانا تو شرک اور حرام ہے۔ محض واسطہ اور ذریعہ سمجھ کر کیا جاتا ہے تو جائز ہے اس میں

عام طور پر لوگوں میں افراط اور تفریط کا عمل نظر آتا ہے۔ صراط مستقیم کی ہدایت صرف آخرت اور دین کے کاموں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ دنیا کے سب کاموں کی درستی اور کامیابی بھی اسی پر موقوف ہے۔

الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ پر اَلْ، لام عہد ہے۔ اس سے مراد وہ سیدھا راست جو بندوں کیلئے خود اللہ تعالیٰ نے کھولا ہے جو دین اور دنیا دونوں کی کامیابی کا ضامن ہے۔

صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ راستہ ان لوگوں کا جس پر آپ نے انعام فرمایا۔ یعنی انبیاء۔ صدیقین۔ شہداء۔ صالحین۔ یہ دراصل مقبولیت بارگاہ الٰہی کے چار درجات ہیں۔ اس آیت میں پہلے مثبت اور ایجابی طریق سے صراط مستقیم کو متعین کیا گیا۔ اسکے بعد آخری آیت میں سلبی اور منفی صورت سے اس کی تعیین کی گئی ہے۔

کتاب۔قرآن

اگر کوئی شخص دنیا بھر کے تمام مذہبوں کی کتابوں کی تاریخ پر نظر ڈالے تو وہ دیکھے گا کہ کتاب اور قرآن یہ دونوں صفات کسی کتاب پر ہر وقت اور ہر زمانے میں پوری ہوتی نظر نہیں آتیں۔

ابتدائے نزول سے آج تک صرف قرآن پر ہی یہ دونوں صفات پوری ہوتی نظر آتی ہیں کہ یہ کتاب بھی ہے اور پڑھی بھی جاتی ہے، ورنہ بہت سی کتابیں لکھی گئیں ہیں تو پڑھی نہیں گئیں پڑھی گئیں تو لکھی نہیں گئیں۔

قرآن کو عربی زبان میں اُتارا۔ اس سے ایک تو عرب پر احسان جتلانا ہے کہ اے عرب تم لوگ دنیا سے الگ تھلگ تھے کسی اور زبان سے تم واقف نہ تھے تم میں

ہزاروں سالوں سے کوئی نبی نہیں آیا تھا۔قرآن، عربی زبان میں اتارا جاتا ہے کہ تم سمجھو اور دوسری قوموں کو سمجھاؤ اسی لیے حدیث میں آتا ہے۔

حدیث: عرب سے تین وجہ سے تم محبت رکھوں۔اس لئے کہ میں عرب ہوں۔ قرآن عربی زبان میں اتارا گیا اور اہل جنت کی زبان عربی ہے۔

غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضالين نہ ان لوگوں کا راستہ جن پر آپ کا غضب کیا گیا۔ان لوگوں کا جو گمراہ ہوئے۔مَغْضُوبِ عَلَيهم سے مراد وہ لوگ ہیں جو دین کے احکام کو جاننے پہچاننے کے باوجود شرارت یا انسانی اغراض کی وجہ سے انکی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں احکام الٰہیہ کی تعمیل میں کوتاہی (یعنی تفریط) کرتے ہیں۔ جیسے عام طور پر یہود کا حال تھا کہ وہ دنیا کے ذلیل مفاد کی خاطر دین کو قربان کرتے اور انبیاء کرام کی توہین کرتے تھے۔اور ضالین سے مراد وہ لوگ ہیں جو ناواقفیت اور جہالت کے سبب دین کے معاملے میں غلط راستے پر پڑ گئے اور دین کی مقررہ حدود سے نکل کر افراط اور غلو میں مبتلا ہو گئے جیسے عام طور پر نصاریٰ تھے۔کہ نبی کی تعظیم میں اتنے بڑھے ان ہی کو خدا بنالیا۔ایک طرف یہ ظلم کہ اللہ کے انبیاء کی بات نہ مانیں۔ انکو قتل کرنے تک گریز نہیں کیے۔ اور دوسری طرف یہ زیادتی کہ ان کو خدا بنالیا۔آیت مذکورہ کا حاصل مطلب یہ ہوا کہ ہم وہ راستہ نہیں چاہتے جو اعراض نفسانی کے تابع بد عمل اور دین میں تفریط کرنے والوں کا ہے۔اور نہ وہ راستہ چاہتے ہیں جو جاہل، گمراہ اور دین میں غلو اور افراط کو کرنے والوں کا ہے۔ بلکہ ان کے درمیان کا راستہ جو سیدھا ہو۔ جس میں نہ افراط ہے نہ تفریط اور جو شہوات اور اغراض نفسانی کے اتباع سے نیز شبہات اور عقائد فاسدہ سے پاک ہے۔

اس پوری سورت کاخلاصہ اور حاصل مطلب یہہ دعاہے کہ یااللہ ہم کو صراط مستقیم کی ہدایت عطافرمااور چونکہ دنیامیں صراط مستقیم کا پہچانناہی سب سے بڑاعلم ہے اور بڑی کامیابی ہے۔ اور اس کی پہچان میں غلطی ہونے سے اقوام عالم تباہ ہوتی ہیں۔

غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ میں فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف اس طرح براہ راست نہیں ہے جس طرح انعام کے ذکر میں ہے۔ اسکی ایک وجہ تو بے ادبی سے بچنا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ انعام ہمیشہ اور ہر حال میں بندے پر اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے اسکے بر عکس خدا کے غضب کا مستحق بندہ اپنے اعمال کے سبب سے خود بنتا ہے۔

مغضوب علیہم سے مراد دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت کی نعمت نازل فرمائی۔ لیکن انہوں نے اپنی سرکشی کے سبب سے نہ صرف یہ کہ اسکو قبول نہیں کیا بلکہ اسکی مخالفت کیلئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور جن لوگوں نے اسکو ان کے سامنے پیش کیا اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے اور قتل کرنے کے درپر ہوگئے۔ جس کی پاداش (بدلہ) میں ان پر خدا کا غضب نازل ہوا۔

دوسرے لوگ وہ جنہوں نے قبول تو کیا لیکن دل کی آمادگی کے ساتھ نہیں قبول کیا بلکہ مارے باندھے قبول کیا پھر بہت شہوات نفس میں پڑ کر انہوں نے اسکے کچھ حصّے کو ضائع کر دیا تو کچھ حصّہ میں کتر بیونت (یعنی کاٹ چاٹ) کر کے اسکو اپنی خواہشات کے مطابق بنالئے۔ اور جن لوگوں نے ان کا ہاتھ پکڑ نیکی کوشش کی یا ان کو صحیح راستے پر لانا چاہا انہوں نے ان میں سے بعض کو جھٹلایا اور بعض کو قتل کر دیا۔ پچھلی امتوں میں اسکی سب سے واضح مثال یہود ہیں۔ چنانچہ ان کے معتوب اور مغضوب ہونے کا ذکر سورہ [المائدة: ٦٠] ﴿قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُم بِشَرٍّ مِّن

ذَٰلِكَ مَثُوبَةً عِندَ اللَّهِ ۚ مَن لَّعَنَهُ اللَّهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ ۚ أُولَٰئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضَلُّ عَن سَوَاءِ السَّبِيلِ﴾

کہو کہ میں تمہیں بتاؤں کہ خدا کے ہاں اس سے بھی بدتر جزا پانے والے کون ہیں؟ وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی اور جن پر وہ غضبناک ہوا اور (جن کو) ان میں سے بندر اور سور بنا دیا اور جنھوں نے شیطان کی پرستش کی ایسے لوگوں کا برا ٹھکانہ ہے اور وہ سیدھے ۔

﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ ۗ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ﴾ [البقرة: ٦١]

اور (آخر کار) ذلت (و رسوائی) اور محتاجی (و بے نوائی) ان سے چمٹا دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہو گئے۔ یہ اس لیے کہ وہ اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے تھے اور (اس کے) نبیوں کو ناحق قتل کر دیتے تھے۔ (یعنی) یہ اس لیے کہ نافرمانی کیے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے

ضالین سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے دین میں غلو کیا۔ جنھوں نے اپنے پیغمبروں کا رتبہ اتنا بڑھا دیا کہ انکو خدا بنا کر رکھ دیا۔ اور یہ لوگ ان ہی عبادتوں اور طاقتوں پر قانع نہیں ہوئے جو اللہ اور اسکے رسول نے مقرر کیں تھیں بلکہ اپنے دل سے رہبانیت کا پورا ایک نظام کھڑا کیا۔ اور جنھوں نے اپنے اگلوں کی ایجاد کی ہوئی بدعتوں اور گمراہوں کی آنکھ بند کر کے پیروی کی۔ اور اس طرح صراط مستقیم سے ہٹ کر گمراہی کی پگڈنڈیوں پر نکل گئے۔ پچھلی امتوں میں اسکی نہایت واضح مثال نصاریٰ ہیں۔[المائدۃ: ۷۷]﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِن قَبْلُ وَأَضَلُّوا كَثِيرًا وَضَلُّوا عَن سَوَاءِ السَّبِيلِ﴾ کہو کہ اے اہل کتاب! اپنے دین (کی بات) میں ناحق مبالغہ نہ کرو اور ایسے لوگوں کی خواہشوں

کے پیچھے نہ چلو جو (خود بھی) پہلے گمراہ ہوئے اور اَور بھی اکثروں کو گمراہ کر گئے اور سیدھے رستے سے بھٹک گئے۔

سورۃ فاتحہ دعا ہے۔

سورہ فاتحہ دعا کے اسلوب میں ہے اس دعا کے اندر جو استدلالی پہلو ہیں انکو ذیل میں اختصاراً واضح کیا جاتا ہے۔ اس میں سب سے پہلے اس امر کا اقرار ہے کہ شکر کا حقیقی سزاوار اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس اقرار کی بنیاد خدا کی پروردگاری، اُسکی رحمانیت اُسکی رحیمیت اور اس کا عدل کی اُن نشانیوں کے مشاہدہ پر ہے جو ہمارے اندر بھی موجود ہیں اور جو اس کائنات کے ہر گوشے میں پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ آدمی کا بچہ ہو یا کسی حقیر سے حقیر حیوان کا، ابھی وہ اس دنیا میں قدم بھی رکھتا نہیں ہے کہ اس کے پرورش کا سامان پہلے سے بالکل تیار موجود ہوتا ہے۔ سامان پرورش کا عالم یہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات تمام چھوٹے بڑے عناصر رات دن اسی کی فراہمی اور اسی کے اہتمام میں سرگرم ہیں۔ سورج بھی اسی کیلیئے سرگرم ہے چاند بھی اس کیلیئے مصروف کار ہے۔ ابر بھی اسی کیلیئے بھاگ دوڑ کر رہاہے اور ہوا بھی ہر آن اس کیلیئے گردش ہے پھر پرورش اور تربیت کا یہ اہتمام ہماری زندگی کے کسی ایک گوشے میں نہیں پایا جاتا بلکہ غور کرنے پر نظر آیئے گا کہ یہ زندگی کے ہر گوشے میں موجود ہے۔ ہمارے ظاہر کی بھی پرورش ہو رہی ہے اور ہمارا باطن بھی زیر تربیت ہے۔ ہمارا جسم بھی پل رہا ہے ہماری عقل کو بھی غزامل رہی ہے۔ ہماری جسمانی قوتیں اور قابلیتیں بھی پروان

چڑھ رہی ہیں اور ہماری روحانی صلاحیتوں کو بھی بالیدگی حاصل ہو رہی ہے۔ غرض ہماری زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جو نظر انداز ہو رہا ہو۔

اس تمام اہتمام اور انتظام سے پرورش کرنے والے کی کوئی ذاتی غرض ہے؟ کیا وہ اپنی سلطنت کی بقاء کیلئے ہمارا محتاج ہے؟ انسان جب ان سوالوں پر غور کرتا ہے تو اسکو صاف نظر آتا ہے کہ اسطرح کی کوئی غرض کا دور دور تک شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔ جس ذات کی قدرت و حکمت کا ادنی کرشمہ یہہ آسمان اور زمیں ہیں۔ تو بھلا وہ ہم جیسے حقیر بھنگوں کی کیا محتاجی ہو سکتی ہے۔ اچھا اگر یہ نہیں ہے تو کیا اس کائنات کے خالق و مالک پر ہمارا کوئی حق قائم کرنے کے قابل کس طرح ہو سکتا ہے؟ اب اگر ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے تو اس پروردگار کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے سوائے اسکے کہ وہ رحمٰن اور رحیم ہے۔ اسکی رحمانیت کا جوش ہے کہ اس نے ہمکو وجود بخشا۔ یہ اس کی رحمیّت کا فیض ہے کہ وہ ہماری دیکھ بھال کر رہا ہے۔ انسان جب خدا کی پروردگاری کے اس اہتمام کو دیکھتا ہے تو یہیں اس پر علم اور معرفت کا ایک اور دروازہ کھلتا ہے یہ دروازہ ایک روز جزا کی آمد کا دروازہ ہے جس دن تنہا وہی پورے اختیار کے ساتھ انصاف کی کرسی پر بیٹھے گا اور نافرمانوں کو ان کی نافرمانیوں کی انصاف کے ساتھ سزا دیگا۔ اور نیکوں کو انکی نیکیوں کا فضل و رحمت کے ساتھ صلہ دیگا۔ خدا کی پروردگاری سے روز جزا پر استدلال قرآن مجید نے جگہ جگہ اسطرح کہا ہے کہ جس خدا نے تمہارے لئے زمین کا فرش بچھایا آسمان کا شامیانہ تانا، جس نے تمہارے لیے سورج اور چاند چمکائے جس نے ابر و ہوا جیسی چیزوں کو تمہاری خدمت میں لگایا جس نے تمہاری ظاہری اور باطنی روحانی اور مادی مطالبات کا بہتر سے بہتر جواب مھیا کیا۔

کیا خود کے بارے میں تم یہ گمان کرتے ہو کہ بس اس نے تمکو یوں ہی پیدا کر دیا ہے اور پیدا کر کے بس یوں ہی چھوڑ دیگا ایسا سوچنا اور سمجھنا نہایت غلط بات ہے۔ پرورش کا یہ سارا اہتمام پکار پکار کر شہادت دے رہا کہ یہ اہتمام کسی اہم غایت اور مقصد کیلئے ہے۔ اور ان لوگوں پر نہایت بھاری ذمہ داریاں عائد کرتا ہے جو بغیر کسی استحقاق کے اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، ایک دن ان ذمہ داریوں کی بابت ایک ایک شخص سے پوچھ ہوگی اور وہی دن فیصلے کا ہوگا۔ جنہوں نے اپنی ذمہ داریاں ادا کی ہونگی وہ سرخ رو ہونگے۔ اور جنہوں نے اسکو نظر انداز کیا ہوگا وہ ذلیل اور نامراد ہونگے۔

یہ مضمون قرآن مجید میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے لیکن اختصار کے خیال سے صرف ایک مثال نقل کرتا ہوں ﴿أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًا﴾ [النبأ: ٦]

یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک رحمٰن اور رحیم ہستی، ظالم اور مظلوم کے ساتھ، ایک ہی طرح کا معاملہ کرے۔ ان کے درمیان ان کے اعمال کی بنا پر کوئی فرق نہ کرے ایسا بالکل ناممکن ہے۔ اگر زندگی کا یہ کارخانہ اس طرح ختم ہو جاتا ہے کہ اسکے بعد سزا اور جزا اور انتقام اور انعام کا کوئی دن نہ آتا تو اسکے معنی یہ ہوئے کہ خالق کی نظر میں متقی اور مجرم دونوں برابر ہیں۔ یہ چیز بالکل غلط اور اسکے رحمان اور رحیم ہونے کے بالکل منافی ہے سورہ قلم ﴿أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ ﴾ ﴿مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ﴾ [القلم: ٣٥-٣٦] کیا ہم فرمانبرداروں کو نافرمانوں کی طرح نعمتوں سے محروم کر دینگے۔ تمکو کیا ہو گیا ہے کیسی تجویزیں کرتے ہو۔)

﴿ كَتَبَ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۚ لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ ۚ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾[الأنعام: ١٢]اس نے اپنی ذات (پاک) پر رحمت کو لازم کر لیا ہے

وہ تم سب کو قیامت کے دن جس میں کچھ بھی شک نہیں ضرور جمع کرے گا جن لوگوں نے اپنے تیئیں نقصان میں ڈال رکھا ہے وہ ایمان نہیں لاتے۔

روز قیامت در اصل خدا کی رحمت کا مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر رحمت کو واجب کر رکھا ہے۔ اسی وجہ سے وہ فیصلے کا ایک دن ضرور لائیگا۔ جس میں وہ سبکو اکٹھا کر کے ان کے درمیان انصاف فرمائیگا۔ اس رحمت کا دوسرا تقاضہ اس دن یہ ہوگا کہ کوئی بھی اس دن اسکے فیصلوں میں مداخلت نہیں کریگا کہ کوئی اپنی سفارش کے ذریعے حق کو باطل اور باطل کو حق بنا سکے۔ بلکہ ہر ایک کیلئے اس دن پورا پورا انصاف ہوگا۔ اثبات سے یہ نکتہ بھی واضح ہو گیا کہ عدل اور رحمت میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ بلکہ عدل عین رحمت ہی کا تقاضہ ہے۔

ربوبیت، رحمت، اور عدل کی ان نشانیوں کے مشاہدے سے اللہ تعالیٰ کیلئے شکر کا جو بے پایاں جذبہ، انسان میں پیدا ہوتا ہے یہی وہ جذبہ ہے جو بندے کو اس بات پر پُر زور طریقہ سے ابھارتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کرے اور اپنی ہر مشکل میں اُسی سے مدد چاہیے۔ اور یہ جذبہ رحمت و ربوبیت کے نشانیوں کا ایک فطری نتیجہ ہے۔ اس طرح اس جذبہ سے سرشار ہو کر بندے کا خدا کی طرف اسکی عبادت کے لئے بڑھنا بھی اسی جذبے کا ایک بالکل فطری نتیجہ ہے۔ اس طرح انسان کا ہر جذبہ اپنا ایک قدرتی ردعمل رکھتا ہے جو ذات اس فیاضی اور اہتمام کے ساتھ پرورش کر رہی ہے جسکی پرورش نہ اسکی طرف سے کسی غرض پر مبنی ہے اور نہ ہماری طرف سے کسی استحقاق پر بلکہ تمامتر اسکی رحمانیت اور رحیمیت کا فیضان عام ہے پھر یہ ربوبیت اور رحمانیت صرف اسی حیات چند روزہ تک محدود نہیں ہے بلکہ اس زندگی

کے بعد بھی اپنے نیک بندوں کیلئے اس نے ابدی زندگی کی حسرتیں محفوظ کر کے رکھ رہا ہے۔

ایسی صورت میں اسکے سوا کون ہے جو انسان کی حقیقی شکر گزاری کا مستحق ہو سکے۔ اگر وہی ہماری حقیقی شکر گزاری کا سزاوار ہے تو پھر اسکے سوا کون ہے جو انسان کی حقیقی شکر گزاری کا مستحق ہو سکتے۔ اور اگر وہی مستحق ہے تو اس کے سوا کون ہے جو اسبات کا حقدار ہو سکتا ہے کہ ہم اسکی عبادت کرے اور مدد چاہیں اسطرح شکر کا جذبہ دھکیل کر بندے کو اسکے منعم حقیقی کے دروازے پر لا ڈالتا ہے۔ بالفاظ دیگر شکر کا جذبہ بندے کے اندر خدا کی عبادت کا داعیہ ابھارتا۔ اس کائنات میں اور خود اپنے وجود کے اندر خدا کی ربوبیت اور اسکی رحمت کے بے شمار آثار دیکھ کر انسان کے اندر اپنے منعم حقیقی کیلئے شکر کا جذبہ اور اس جذبے کی تحریک سے انسان کے اندر اسکی عبادت کرنے کا ولولہ پیدا ہونا ایک ایسی بات ہے جو ہر پہلو سے بالکل ایک فطری اور بدیہی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ جس میں کسی دلیل کی ضرورت نہ رہی۔

دیکھنے سے شوق پیدا، شوق سے پیدا طلب
دل کی دشمن آنکھ تھی، دل دشمن جان ہو گیا

اقرار بندگی اور اظہار اعتماد اور توکل کے اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ کی دعا ہمارے سامنے آتی ہے۔ اور اسی دعا پر جو اس تمہید کے بعد اصلی حرف مُدّعا کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ سورت ختم ہو جاتی ہے اسکے بعد مَغضُوبُوں اور گمراہوں کی روش سے اظہار بیزاری کا جو مضمون آتا ہے وہ منفی پہلو

سے اس دعا کی مزید توضیح ہے۔ اسبات کو صریح دُعا کے اسلوب میں کہنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی اپنے عقل اور سمجھ بالکل عاجز ہے۔ صرف خدا ہی بتا سکتا ہے کہ صراط مستقیم کیا ہے؟ اور وہی ہے جو صراط مستقیم کو اختیار کر لینے کے بعد اس پر جمے رہنے کی توفیق بخش سکتا ہے۔ بس یہیں سے انسانی فطرت کے اندر وہ فکر نمایاں ہوتا ہے جس کے سبب سے وہ نبوت اور رسالت کا محتاج ہوا ہے۔ انسان کیلئے اپنی عقل سے یہ معلوم کرنا ناممکن ہے کہ ایسے خدا کی بندگی اور اطاعت کا طریقہ کیا ہے؟ اسی طریقہ کو بتانے کیلیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کو بھیجا ہے۔

یہ سورت دعا کے اعتبار سے اس قدر اہم ہے کہ ہماری سب سے بڑی عبادت نماز اس کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ حضرت ابوھریرہ سے روایت ہے کہ، رسول ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندہ کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس کا نصف حصہ میرے لئے ہے اور نصف میرے بندے کیلئے ہے۔ اور میرے بندے کو وہ بخشا گیا جو اس نے مانگا۔ جب بندہ ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میرا شکریہ ادا کیا اور جب وہ ﴿الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ﴾ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری تعریف بیان کی ہے اور جب وہ ﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ﴾ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری بڑائی بیان کی اور جب بندہ ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ کہتا ہے تو اللہ تعالی فرماتا ہے یہ حصہ میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترکہ ہے اور میں نے اپنے بندے کو وہ بخشا جو اس نے مانگا پھر جب بندہ ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہہ میرے بندے کیلئے ہے اور میں نے

اپنے بندے کو وہ بخشا جو اس نے مانگا (صحیح مسلم شریف)۔ مذکورہ حدیث مبارکہ میں اس سورت کا جو حقیقت افروز اور معنی خیز تجزیہ ہے وہ بجائے خود اس قدر واضح ہے کہ اس پر کسی بحث کی ضرورت نہیں ہیں۔ البتہ اسکے اُس پہلو پر ہم غور کرنا چاہیے کہ آخر وہ کیا چیز ہے جو اس کے لفظ لفظ کے اندر یہ تاثیر بھر دی ہے کہ بندے کی زبان سے لفظ ابھی نکالا نہیں کہ بارگاہ ربّ الغیرت سے اس کی سند قبولیت اسکو عطا ہو گئی۔ دعائیں اور بھی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ لیکن شاید ہی کسی دعا کے متعلق اس تفصیل سے بتایا گیا ہے اس کا ایک ایک لفظ کا خود اس ذات پر کیا اثر پڑتا ہے جس سے دعا مانگی جاتی ہے اور وہ کن لفظوں میں اسکو قبول فرماتا ہے۔

اس سورت میں جس چیز کیلئے دعا کی گئی ہے اس سے اعلی اور اس کے برتر کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی۔ اس دُعا میں بندہ خدا سے خود اس تک پہنچنے اور اسی کو پانے کے سیدھے رستہ کی ہدایت مانگتا ہے۔ دُعا عین اس مقصد کیلئے ہے جس کے لیے اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ یہ ایسے معاملہ میں خدا کی رہنمائی کی دعا ہے جس میں انسان کی اپنی عقل بالکل عاجز ہے وہ صرف خدا کی رہنمائی سے اسکو پا سکتا ہے اور ایسی کی توفیق سے اس کو پا کر اس پر قائم بھی رہ سکتا ہے۔

سورت الفاتحہ دعا ہے اور اس کی تمہید سے بہتر تمہید نہیں ہو سکتی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس تمہید یا دعا کا آغاز اعتراف شکر سے کیا گیا ہے۔ اور شکر ہی وہ چیز ہے جس سے بندہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا مستحق قرار پاتا ہے۔ شکر گزار لوگوں کی نعمتوں میں اللہ اضافہ ہی فرماتا ہے۔ سورہ [القمر : ٣٥] ﴿نِّعْمَةً مِّنْ عِندِنَا ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي مَن شَكَرَ﴾ اپنے فضل سے شکر کرنے والے کو ہم ایسا ہی بدل دیا کرتے ہیں۔ سورہ

ابراھیم ﴿لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ ﴾ [إبراهيم: ٧] اگر تم میرے شکر گزار ہونگے تو میں تمہارے لئے اپنی نعمتوں میں اضافہ کرتا رہوں گا) دوسری چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جن صفتوں کے تَوَسُّل سے یہ دعا کیگئی ہے دوسری تمام صفات کیلئے بمنزلہ بنیاد ہے۔اس وجہ سے اس دعا میں گویا اللہ کے سارے ہی صفات یعنی اسماء حسنی کا سہارا حاصل کر لیا گیا ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ میں کامل سپردگی ہے تقدیم مفعول سے زور تاکید پیدا ہوتی ہے۔جب بندہ اس دنیا سے کٹ کر خود کو اپنے رب کے آگے ڈال دیگا تو آخر اسکی دعا کا ایک ایک حرف کیوں نہ شرف قبولیت پائیگا۔ اِہدِنا کا مفہوم صرف اسی قدر نہیں ہے کہ ہمیں سیدھا راستہ بتا بلکہ یہ بات بھی اسی اسلوب میں چھپی ہوتی ہے کہ اس راستے کیلئے ہماری آنکھیں کھول دے اس پر چلنے کا ہمکو شوق اور ولولہ عطا فرما۔ ہمارے دلوں میں اسکی محبت جاگا دے اور اس پر ہمیں زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرما اور اسی پر مرنے کی سعادت نصیب کر۔اور ان لوگوں سے بیزاری کا اظہار بھی ہے جنھوں نے اپنی شرارت یا حماقت کی وجہ سے اس سے انحراف کیا ہے۔ سورۃالفاتحہ کو تین وجوہات کی بناوپر دیباچہ قرآن ہونے کا مرتبہ حاصل ہے اس سورت فاتحہ الکتاب کا نام دیا گیا ہے۔جس کے صاف معنی دیباچہ القرآن ہی کے ہیں۔اسی طرح اسکے لئے ام الکتاب یعنی لفظ یعنی قرآن کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے جو پہلے لفظ سے بھی زیادہ اسکی اہمیت کو واضع کرنے والا ہے۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سورہ اپنے اندر تمام قرآنی مطالب کو سمیٹے ہوئے ہیں۔

سورہ الفاتحہ ایک دیباچہ ہے

تین وجوہات کی بناء پر اس سورت کو دیباچہ قرآن کا مرتبہ حاصل ہو گا۔

(۱) پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس سورت میں دین اور شریعت کے نقطہ آغاز کا پتہ دیا گیا ہے۔ کہ یہ سورت ہم کو بتاتی ہے کہ خداپرستی کا اولین محرک کیا ہے۔ یہ محرک کن عوامل کا نتیجہ ہے۔ اس تحریک سے انسان، خداپرستی کی راہ میں پہلا قدم کیا اٹھاتا ہے۔ اور اس قدم کے بعد اسکے اندر عمل طلب اور جستجو اس چیز کیلئے پیدا ہوتی ہے۔ یہ سورت بتاتی ہے کہ آفاق اور اَنفُسْ کے اندر خدا کی ربوبیت اسکی رحمانیت اور رحیمیت اور اس کے عدل کی جو نشانیاں ہیں وہ انسان کے اندر خدا کے شکر کا جذبہ ابھارتی ہے۔ یہ جذبہ ایک زور دار محرک بن کر انسان کو خدا کی عبادت اور اسی سے استعانت کیلئے اکساتا ہے۔ اسکے بعد انسان میں اس سیدھے راستہ کی طلب و جستجو پیدا ہوتی ہے جو اسکو خدا تک پہنچائے۔

انسان کی اس طلب و جستجو کو پورا کرنیکے لیے اللہ تعالیٰ نے نبوت اور رسالت کا سلسلہ اور اس کا نظام قائم فرمایا اور اپنی ہدایت اور شریعت نازل فرمائی۔ مذہب کی راہ میں انسان کا فطری ارتقاء اسی طرح ہوا ہے۔ اور اس سورت میں یہ حقیقت چونکہ نہایت اجمال اور خوبی کے ساتھ واضح ہوئی ہے اس وجہ سے اسکو دیباچہ قرآن کی جگہ ملی۔ یعنی قرآن کا مقدم یا پیش لفظ یا قرآن کی تمہید۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن کے جو مطالب بیان ہوئے ہیں انکو اگر سمیٹا جائے تو تین عوانوں کے تحت جمع کئے جا سکتے ہیں۔

توحید --- قیامت --- رسالت

سورۃ فاتحہ ان مذکورہ تینوں عنوانوں پر بنیادی رہنمائی دیتی ہے۔ اس وجہ سے اس نے گویا قرآن کے سارے علوم کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے اسکی ابتدائی دو آیات میں خدا ہی کا تمام عالم کا مالک اور آقا ہونا اور تمام حمد اور شکر کا سزاوار ہونا بیان ہوا ہے۔ اس کی تیسری آیت میں ایک روز جزا اور سزا کی آمد کی طرف اشارہ ہے۔ اور ساتھ ہی توحید کا مضمون بھی شامل ہے کہ اس دن اللہ کے سوا کسی اور کا زور اور اختیار نہیں چلے گا۔ اسکی چوتھی آیت میں بندہ خود کو بالکل اپنے رب کے حوالے کر دیتا ہے اور یہی توحید کی اصل حد ہے۔ پانچویں آیت میں اصل دعا ہے اور اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ انسان اللہ کی سیدھی راہ معلوم کرنے کے لئے نبوت اور رسالت کے سلسلے وار سے نازل کردہ ہدایت اور شریعت کا محتاج ہے۔ نیز اسی لپیٹ میں یہ حقیقت بھی واضع ہو گئی ہے کہ خدائی شریعت پانے کے بعد کسی قوم پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور اسکی قدر کرنے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کیا معاملہ کرتا ہے۔

غرض اس سورت کے اندر دین کے تمام بنیادی عناصر جمع ہیں۔ اگر ان کی تفصیل کر دی جائے تو دین کا پورا نظام کھڑا ہو جائے، گویا ان چند آیات کے اندر پورا قرآن بند ہے۔ اور اس چھوٹے سے نگینہ کے اندر معانی اور حقائق کا وہ پورا شہرستان دکھا دیا گیا ہے جو قرآن کے ۳۰ پاروں کے اندر پھیلا ہوا ہے۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے باطن کی یہی پیاس جو اس سورت سے ظاہر ہو رہی ہے وہی در حقیقت نزول قرآن کا سبب بنی ہے۔ اللہ نے اُمّت محمدیہ سے پہلے یہود اور نصاری کو صراط مستقیم دیکھایا تاکہ وہ خود بھی اس پر چلے اور دوسروں کو بھی اس پر چلنے کی دعوت دیں۔ لیکن وہ اس راہ پر نہ خود قائم رہے اور نہ دوسروں کیلیئے انھوں نے اسکے نشانات باقی رہنے دیے۔ انھوں نے اس راہ حق کو گم کر کے دنیا کو جاہلیت کے اندھیرے میں ڈال دیا تھا۔ سورت فاتحہ اسی اندھیرے سے نکلنے کی دعا ہے اور ایک ایسی دعا ہے جو فطرت انسانی کی گہرائیوں سے نکل رہی ہے، یہی دعا ہے جسکی برکت سے دنیا کو قرآن کی روشنی ملی اور جاہلیت کی تاریکی سے نکلنا آسان ہوا۔ یہی دعا ہے جو قرآن مجید کے فہم اور تدبر اور اس سے زندگی کے مسائل میں رہنمائی حاصل کرنے کے معاملہ میں بھی ہمارے قدم کو سیدھے راستے پر قائم رکھ سکتی ہے۔ اس پہلو سے بھی یہہ صورت دیباچہ قرآن بننے کیلیئے نہایت موزوں ہے۔

سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ میں تعلق

اس سورت کا تعلق بعد کی سورتوں سے یعنی سورہ بقرہ سے کیسا ہے؟ پورے قرآن سے اس سورت کا تعلق کیسا ہے؟ اُسکی تفصیل اوپر آچکی۔ اب اس سورت کا بعد کی صورت یعنی سورہ بقرہ سے کیسا ہے؟۔ سورہ فاتحہ کی آخری آیت اور سورہ بقرہ کی پہلی آیت پر غور کریں تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں سورتوں میں وہی تعلق ہے جو تعلق ایک دعا اور اسکے جواب میں ہوتا ہے۔ یا دعا اور اس کے اثر اور اسکی

قبولیت میں ہوتا ہے۔ سورہ فاتحہ کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے۔﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾۔ ہمکو سیدھے راستے کی ہدایت دیے اُن لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے انعام فرمایا جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ ہوئے۔اسکے بعد سورت بقرہ اسطرح شروع ہوتی ہے۔ ﴿الم﴾﴿ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ ۛ فِيهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ﴾ یہہ کتاب الٰہی ہے اسکے کتاب الٰہی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ یہ خدا ترسوں (یعنی خدا سے ڈرنے والوں کیلئے ہدایت بن کر نازل ہوئی ہے۔) گویا سورۃ فاتحہ میں جس آسمانی ہدایت اور رہنمائی کیلئے دعا کی گئی تھی سورت بقرہ میں وہ آ گئی ہے۔

ایک صاحب ذوق جب دُعا کے بعد اس کے نتیجے کو سامنے دیکھتا ہے تو اسکی روح خدا کے شکر کے جذبے سے سرشار ہو جاتی ہے اسکے علاوہ ایک اور پہلو بھی سامنے رکھنا چاہیے وہ یہ کہ سورہ فاتحہ میں مُنعَم علیھم جماعت کے راستہ کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ مغضوب اور گمراہوں کے طریقوں سے بچنے کیلئے بچائے جانے کیلئے بھی دعا ہے۔ دعا کے اس پہلو کو سامنے رکھ کر جب کوئی سورہ بقرہ کی تلاوت کرتا ہے تو صاف نظر آتا ہے کہ اس سورت میں ملت ابراہیمی کے تجدید کے ساتھ ساتھ یہود کے ان جرائم کی فہرست بھی بیان ہو گیا ہے۔ جو انہوں نے خدا اور اسکے نبیوں اور رسولوں اور اسکی شریعت کے خلاف کیے ہیں۔ اور جن کے سبب سے وہ اسبات کے مستحق ٹھیرے۔ کہ ان پر خدا کا غضب نازل ہوا اور وہ قوموں کی امامت کے منصب سے معزول کیے جائیں۔

گویا سورہ فاتحہ میں جس انعام یافتہ اور اسکے مقابل جس مغضوب گروہ کی طرف ایک اشارہ تھا، سورہ بقرہ میں اُن دونوں گروہوں سے متعلق پوری تفصیل سامنے آ گئی اور واضع ہو گیا کہ کن کی پیروی کرنی ہے اور کن کے طریقوں سے بچنا ہے۔ بالکل یہی صورتحال سورت آل عمران کی ہے کہ جس طرح سورہ بقرہ میں یہود کی شرارتوں کی تفصیل ہے اسی طرح آل عمران میں نصاری کی بدعتوں اور انکی گمراہیوں کی تردید کی گئی ہے۔ اور ساتھ ہی اس میں اس اسلام کی صحیح تصویر بھی پیش کی گئی ہے جسکی دعوت حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے انبیاء کرام بالخصوص حضرت مسیحؑ نے دیا ہے۔ سورہ فاتحہ کے بعد ان ہی دو بڑی سورتوں کا جگہ پانا اسبات کا واضح قرینہ ہے۔ کہ یہ بعد کی دونوں سورتیں، سورہ فاتحہ کی مقبولیت اور اسکے آخری حصے کے اجمالات کی شرح ہیں۔

وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤلف و جملہ معاونین و اہل و عیال کو اجر کثیر سے نوازے اور اس کتاب کو ان کی میزان میں حسنات کا ذخیرہ بنادے اور اس کا نفع عام فرمادے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو آخرت کا یقین، عقل سلیم اور فکر مستقیم عطا فرمائے۔

مؤلف

قاری محمد ارشاد علی

مولوی عالم (نظامیہ) بی۔کام (عثمانیہ)

ڈی۔ یف۔ ی۔ ناگپور کالج

مؤلف کتاب "اصلاحی تحفہ" خادم تدریس القرآن

باہتمام

صاحبزادہ محمد طاہر علی

ISLAHI TOHFA